دو خدائی خدمت گار

مصنفہ

مہادیو ڈیسائی

تقریب از مہاتما گاندھی

مترجمہ

محمود علی خان

(جامعہ پریس دہلی)

"عدم تشدّد قریب قریب میرا مذہب بن گیا ہے
میں گاندھی جی کی اہنسا کا پہلے بھی قائل تھا لیکن اس تجربہ کو
جو بے نظیر کامیابی میرے صوبہ میں حاصل ہوئی اس کے بعد
تو میں دل وجان سے عدم تشدد کا حامی بن گیا ہوں انشاءاللہ
میرے صوبہ کے لوگ کبھی تشدد سے کام نہیں لیں گے ممکن
ہے کہ میں ناکامیاب رہوں اور میرے صوبہ میں تشدد کا طوفان
برپا ہو جائے۔ ایسا ہوا تو میں اپنی قسمت کو صبر کر کے بیٹھ
رہونگا۔ مگر اس سے میرے اس عقیدے میں کوئی تبدیلی
نہیں ہوگی کہ عدم تشدّد اچھی چیز ہے اور میری قوم کو اسکی
سب سے زیادہ ضرورت ہے۔"

تقریب

میرا بہت جی چاہتا تھا کہ کچھ دن خان عبدالغفار خاں کے ساتھ رہوں مگر کبھی اسکا
موقع نہیں ملتا تھا۔ پچھلے سال کے آخری مہینوں میں یہ آرزو پوری ہوئی۔ میری خوش قسمتی
سے صرف خاں صاحب ہی نہیں بلکہ اُن کے بڑے بھائی ڈاکٹر صاحب بھی ہزاری باغ
جیل سے رہا ہوتے ہی سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ بات یہ تھی کہ ان دونوں کو
۲۸ دسمبر ۳۴ء تک صوبہ سرحد میں داخل ہونے کی ممانعت ہوگئی تھی اور اس کی خلاف
ورزی وہ کانگریس کے فیصلہ کی وجہ سے کر نہیں سکتے تھے اس لیئے انھوں نے جمنا لال
بجاج کی دعوت قبول کر لی اور وردھا آ گئے۔ اس طرح مجھے ان سے کھل کر ملنے کا موقع
نصیب ہوا۔ جوں جوں اُن سے واقفیت بڑھتی گئی میرا دل ان کی طرف کھنچتا گیا۔ انکے خلوص اور
صاف گوئی اور ان کی انتہائی سادگی کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ انھوں نے
سچائی اور عدم تشدد کو مصلحت کی بنا پر نہیں بلکہ عقیدے کے طور پر اختیار کر لیا ہے
چھوٹے بھائی کو میں نے مذہبی جوش میں بھرا ہوا پایا، مگر وہ تنگ نظر نہیں ہیں، بلکہ
صلح کل مسلک رکھتے ہیں ان کی سیاست اگر کچھ ہے تو وہ مذہب پر مبنی ہے اور ڈاکٹر صاحب کو
تو سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس ملاقات سے مجھے معلوم ہوا کہ لوگوں نے ان دونوں
بھائیوں کو کچھ کا کچھ سمجھ لیا ہے۔ اس لیے میں نے مہادیو ڈیسائی سے کہا کہ ان سے ان کی

زندگی کے جو کچھ حالات معلوم ہو سکیں وہ لکھ لو اور ان کی سیرت کا ایک چھوٹا سا خاکہ تیار کرو تاکہ لوگ انھیں انسان کی حیثیت سے دیکھ سکیں۔ اس میں نہ سیاست کا ذکر ہو نہ حکومت کی نکتہ چینی۔ چنانچہ یہ رسالہ لکھا گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ان دونوں بھائیوں کی زندگی کے سچّے واقعات ہیں جو انھوں نے مہادیو ڈیسائی سے بیان کیے تھے۔ پڑھنے والے خود فیصلہ کرلیں گے کہ ان کا سیدھے سادے خدائی خدمتگار ہونے کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں۔

م۔ک۔ گاندھی

دہلی۔ ۱۴۔ جنوری ۱۹۳۵ء

باب اول

صوبۂ سرحد

ہندوستان کی جنگ آزادی جو گذشتہ پندرہ سال سے جاری ہے کئی چیزوں کے لحاظ سے زلزلہ سے مشابہ ہے۔ چونکہ یہ بالکل پرامن ہے اس لیئے زلزلہ کی سی تباہ کن اور ہیجانی کیفیتیں اس میں نہیں تاہم اس نے ہماری قومی ہستی کی بنیادوں کو اسی طرح ہلا دیا ہے جیسے زلزلہ زمین کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ صدیوں کے تعصبات اور قوتِ اقتدار کی عمارتیں اگر گری نہیں تو ان کی بنیادیں ضرور متزلزل ہوگئی ہیں اور سیاسیات کا نقشہ اسی طرح بدل گیا ہے جیسے قدرتی زلزلے سے سطحِ زمین کا نقشہ بدل جاتا ہے۔

اب سے بیس سال پہلے جلیانوالا باغ۔ باردولی اور چوراچوری کو کون جانتا تھا جیرالہ پیرالہ۔ ویدارنیم اور بورسد سے کون واقف تھا، اور قرب و جوار کے باشندوں کے علاوہ ڈانڈی۔ دھرسانا اور رودالہ کا نام کس نے سنا تھا؟ ہندوستان کے نقشے میں اوّل تو یہ مقامات ہی نہیں ہوں گے اور جو ہوں بھی اُن کی کوئی خاص حیثیت نہ ہوگی لیکن ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ لکھنے والے کے لیئے ان کی اور اسی قسم کے اور مقامات کی بہت بڑی اہمیت ہوگی۔

یہ مقامات تو بہت چھوٹے چھوٹے ہیں، اگر یہ بیس برس پہلے مشہور نہ تھے تو کوئی تعجب

نہیں لیکن ۱۹۳۰ء سے پہلے صوبہ سرحد کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی، پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں یہ صوبہ منظر عام پر آیا اور اس وقت سے ان واقعات کی وجہ سے جن میں سے بعض ہم جانتے ہیں اور بعض نہیں جانتے، برابر ہماری توجہ کا مرکز رہا ہے، صوبہ سرحد کے متعلق اخبار بین حضرات کا یہ تخیل تھا کہ شمالی مغربی افق پر یہ ایک خونی دھبہ ہے اور بس، جب کبھی اس کا تذکرہ آتا خود انگریزوں کا بنایا ہوا روسی ہوّا ہماری نظروں کے سامنے آجاتا۔ تاریخ داں حضرات سرحدی اقوام کے خلاف برطانیہ کے تادیبی حملوں کا حال پڑھ کر حیرت میں رہ جاتے تھے کیونکہ ان حملوں کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ برطانیہ ان کو کچھ رقم دینا منظور کرتی تھی تاکہ وہ سرحد پر امن قائم رکھیں اور نازک موقعوں پر اس کا ساتھ دیں مس ایلس کے اغوا کے واقعات ہمارے کانوں میں پڑے تھے لیکن اس سے کسی قوم یا طبقہ کی سیرت پر اتنی روشنی نہیں پڑتی جتنا اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر حکمراں قوم کے کسی فرد پر دست درازی کیجائے تو کس طرح ایک عظیم الشان سلطنت کی ساری قوتیں کام میں لائی جاسکتی ہیں، جاہل اور ان پڑھ دیہاتی صرف اتنا جانتے تھے کہ سرحد ایک ملک ہے جہاں سے جابر اور ظالم سودخوار پٹھان آتے ہیں اور سود کا روپیہ جمع کر کے یا کوئی جرم کر کے جب وہاں چلے جاتے ہیں تو پھر ہاتھ نہیں آتے۔

لیکن ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کے واقعات نے یہ دکھا دیا کہ صوبہ سرحد میں بھی ایسے لوگ رہتے ہیں جو ہماری طرح سوچتے اور سمجھتے ہیں جنھوں نے آزادی کی جنگ میں اتنا ہی

حصّہ لیا جتنا دوسرے صوبوں کے باشندوں نے بلکہ اُن سے زیادہ مصیبتیں برداشت کیں،
اور اُن سے زیادہ قربانیاں کیں ۱۹۳۱ء میں جو حضرات کراچی کے اجلاس کانگریس میں
شریک ہوئے انھیں پہلی مرتبہ خان عبدالغفار خاں اور اُنکے ساتھیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا
اُس وقت یہ دیکھکر حیرت ہوگئی کہ سیدھے سادے آسانی سے مشتعل ہوجانے والے
قوی ہیکل پٹھان بھی ایک ایسی جماعت کے رکن ہوسکتے ہیں جو عدم تشدد کی پابند ہو
یعنی وہ انتہائی تشدد کے باوجود اپنی سرگرمیاں پُرامن طریقے سے جاری رکھ سکتے ہیں،
مختلف ملکوں کے باشندوں کے حالات جن کتابوں میں درج ہیں اُن میں پٹھان کی آن بان
اور اُس کے عزم و استقلال کے بہت سے قصّے بھی ملتے ہیں جن سے اس طرح کے واقعات
کہ کسی رومی نے جلتی ہوئی آگ میں اپنا ہاتھ دیدیا اور وہیں رکھے رہا یہاں تک کہ وہ جلکر
خاک ہوگیا یاد آجاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ایک پٹھان ڈاکو نے کسی کے مکان میں نقب
لگائی ابھی اُس نے ہاتھ اندر ڈالا ہی تھا کہ مالک مکان جاگ اُٹھا اور فوراً اس ڈاکو کا ہاتھ
پکڑ کر چلاّنا شروع کیا ڈاکو نے گرفتار ہونا گوارا نہ کیا اور اپنا ہاتھ کلائی پر سے کاٹ ڈالا
اور مالک مکان اس کے ہاتھ کو لیئے ہوئے دھڑ سے پیچھے جا پڑا۔ پٹھانوں کی اس
پُرامن جنگ میں بھی ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے ان کی باوقار اور پُرعظمت
شجاعت اور استقامت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ خان برادران کے ایک چچیرے بھائی
حاجی شاہ نواز خاں تھے ۱۹۳۰ء میں اُنسے بھی ضمانت طلب ہوئی لیکن اُنھوں نے

ضمانت داخل نہ کی اور جیل چلے گئے۔ اس کے بعد بعض خانگی حالات سے مجبور ہو کر اُنھوں نے ضمانت داخل کر دی اور رہا ہو گئے لیکن اُن کے جو اعزا جیل سے باہر تھے اُنھوں نے کسی طرح اسے گوارا نہ کیا ان کی رائے تھی کہ حالات کچھ بھی سہی ضمانت ہرگز نہ دینا چاہیئے تھی، اس لیے یہ تجویز کیا گیا کہ وہ ضمانت نامہ کی کسی نہ کسی طرح خلاف ورزی کر کے پھر جیل چلے جائیں۔ کچھ عرصہ تک اُنھوں نے اس مسئلہ پر غور کیا اس کے بعد خاموشی سے خودکشی کر لی اور ایک خط لکھکر رکھدیا کہ میری وجہ سے خاندان کی عزت کو جو بٹہ لگا ہی اس کی تلافی جیل واپس جانے سے نہیں ہو سکتی بلکہ اسی طرح ہو سکتی ہی۔

سیّد عبدالودود بادشاہ ایک مشہور کارکن، مذہبی پیشوا اور بڑے زمیندار تھے وہ صوبہ سرحد کے برطانوی اضلاع کے نہیں بلکہ مالاکنڈ ایجنسی کے رہنے والے تھے ضمانت ہی کی دفعہ کے ماتحت وہ کوئی تین سال تک جیل میں رہے ۱۹۳۱ء کے گاندھی اِرون معاہدہ کے دوران میں بھی وہ رہا نہ ہوئے۔ اُن کے والد بہت ہی علیل اور قریب مرگ تھے، انھوں نے محض اس خیال سے کہ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے لڑکے کو دیکھ لوں اُن کی طرف سے ضمانت داخل کر دی، سید صاحب اپنی اس رہائی پر سخت برہم ہوئے اور انھیں اتنی شرمندگی ہوئی کہ اپنے بوڑھے باپ کے صدمہ کا بھی خیال نہ کیا اور اپنے گولی مارلی۔

ظاہر ہی کہ ہر شخص اس قسم کے حالات معلوم کرنیکا خواہشمند ہوگا جو کسی کی سامنے

سرنہیں جھکاتی اور جس میں ایسے ایسے جانباز بہادر پیدا ہوتے ہیں۔ خان برادران بھی حال ہی میں ہزاری باغ جیل سے رہا ہوئے ہیں جہاں وہ شاہی قیدی کی حیثیت سے نظربند تھے، رہائی کے بعد خوش قسمتی سے مجھے اُن سے کھل کر ملنے کا موقع ملا۔ ان دونوں بھائیوں سے محبت تو پہلے ہی سے تھی ان صحبتوں نے اس محبت میں اور اضافہ کر دیا۔ انھوں نے مجھے اپنی زندگی کے متعلق ہر طرح کے سوالات کرنے کی اجازت دی۔ ان کی داستان اتنی مسحور کرنے والی ہے کہ میں چاہتا ہوں اسکا کچھ حصّہ ضبط تحریر میں لے آؤں تاکہ ناظرین بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ان دونوں بھائیوں کو رہائی کے بعد صوبہ سرحد میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یقین ہے کہ ناظرین بھی میری طرح تعجب کریں گے کہ امن اور عدم تشدد کے ان علمبرداروں کے داخلے پر آخر کیوں یہ پابندی عائد کی گئی۔

باب دوم

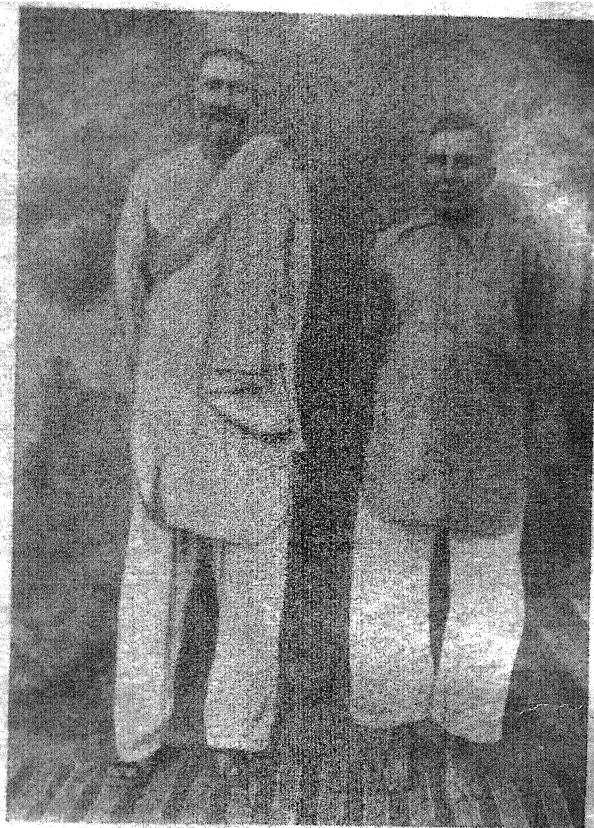
پیدائش اور حسب و نسب

میرے دریافت کرنے پر چھوٹے بھائی (خان عبدالغفار خاں) نے کہا "میں آپ کو اپنی پیدائش کا سنہ تو بتلا سکتا ہوں لیکن تاریخ نہیں بتلا سکتا کیوں کہ میں چاند کے مہینہ جیٹھ کے حساب سے تاریخ جانتا ہوں عیسوی تاریخ مجھے نہیں معلوم"۔

"او ہو۔ جیٹھ!" مینے حیرت سے کہا۔ "جیٹھ تو ہمارے یہاں بھی ہوتا ہی"۔

خان عبدالغفار خاں نے جواب دیا "ہاں بیشک۔ ہمارے آپ کے یہاں بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں، لیکن ہمیں اُن کا علم نہیں۔ ہماری روایات۔ ہماری رسم و رواج اکثر آپ ہی کے سے ہیں۔ کیونکہ بہرحال یہ ظاہر ہی کہ ہمارا صوبہ صدیوں تک بودھ مت کا پیرو رہا ہی۔ ہمارے ضلع میں بودھ زمانہ کے آثار جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ ابتک بہت سی قصبوں کے نام بودھ انداز کے یا ہندوانہ ہیں اور پشتو کے بہت سے الفاظ سنسکرت سے لیے گئے ہیں"۔

بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب ۱۸۸۳ء میں اور چھوٹے بھائی خان عبدالغفار خاں ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ محمد زئی پٹھان ہیں۔ زئی کے لفظی معنی ہیں "نسل سے" گویا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس کی نسل سے ہیں۔ خان کے معنی "سردار" کے ہیں سرحد پر سب قوموں کے نام اپنے بزرگوں کے نام پر ہوتے ہیں۔ خان برادران کے والد



ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خان

خان بہرام خانصاحب موضع اُتمان زئی کے خان تھے۔ یہ چھوٹا سا موضع ضلع پشاور کی تحصیل چارسدہ میں واقع ہے۔ چارسدہ پشاور سے کوئی بیس میل ہوگا اور اتمان زئی تحصیل چارسدہ سے کوئی دو میل پر دریائے سوات کے کنارے بڑے پر فضا مقام پر آباد ہے یہاں سے کوئی ۳۰ میل مغرب کی جانب مہمندوں کا علاقہ ہے۔ اسی علاقہ میں سے گزر کر افغانستان جاتے ہیں۔ چونکہ اس فضا میں وہ پیدا ہوئے اور اسی میں انھوں نے پرورش پائی اس لئے لازمی طور پر وہ قدرتی مناظر کے دلدادہ ہیں اور جدید تہذیب کے پُر تکلف مقامات میں انھیں چین نہیں ملتا۔ بڑے بھائی نے پورے گیارہ سال انگلستان میں گزارے ہیں اور وہاں کی بہترین تعلیم حاصل کی ہے لیکن اکثر اپنی گفتگو کے دوران میں بار بار وہ انھیں پہاڑیوں۔ اُسی ندی۔ اور اُسی چھوٹے سے جزیرہ کا تذکرہ کیا کرتے ہیں جہاں انھوں نے اپنا ایک عزلت خانہ بنا لیا ہے اور جہاں مہاتما جی کو کبھی اپنا مہمان بنانے کی انھیں بڑی آرزو ہے۔ وہ مہاتما جی سے کہا کرتے ہیں "وہاں آپ کا آشرم ہوگا۔ ہمارے نزدیک اس سے زیادہ پُرسکون اور خوشگوار مقام نہیں ملسکتا۔ پشاور کی ساری وادی میں پھلوں کی افراط ہے اور یقین کیجئے کہ وہاں آپ کا وزن بہت بڑھ جائیگا" وہ اکثر اپنے گنے کے کھیتوں کا تذکرہ کیا کرتے ہیں۔ گایوں کے اُس خالص اور صحت بخش دودھ کا جس سے وہ صرف مکھن نکالا کرتے تھے اور بھینس کے اُس گاڑھے دودھ کا جسے وہ اور کاموں میں لاتے تھے۔ لیکن آج وہ کھیت کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں یہ ہمیں

نہیں معلوم!" وہ ایک سرد آہ کے ساتھ کہتے ہیں لیکن اس سے کسی شکست یا یاوسی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ فطری جذبہ ظاہر ہوتا ہے جب ایک جلاوطن کو اُسکے وطن کی یاد ستاتی ہے۔

جس وقت ان دونوں بھائیوں نے اپنے والد کا تذکرہ مجھ سے کیا تو یکایک مجھے پٹیل برادران کے والد کا خیال آگیا دونوں داستانوں میں بڑی دلچسپ مشابہت ہے، پٹیل برادران کے والد اور خان برادران کے والد دونوں بڑے مذہبی لوگ تھے دونوں نے نوّے برس سے زیادہ عمر پائی اور دونوں کا اپنے بچوں کی پرورش میں یکساں ہاتھ تھا لیکن یہ مشابہت یہیں پر ختم ہوجاتی ہے کیونکہ اگر پٹیل برادران نے اپنی ذاتی کوششوں سے اتنا عروج پایا تو خان برادران کی ترقی بڑی حد تک ان کے والد کی رہین منت ہے خان برادران کے والد پورے موضع کے زمیندار تھے اور کم از کم ان کی اتنی حیثیت ضرور تھی کہ اپنے لڑکے کو انگلستان بھیج سکیں، بخلاف اس کے پٹیل برادران کے والد کی بہت معمولی حیثیت تھی اور ان کے لڑکوں کو اپنی تعلیم کا خود انتظام کرنا پڑا پٹیل برادران کے والد کو دنیا کی باتوں سے کچھ زیادہ سروکار نہ تھا۔ وہ ایک گوشہ نشین آدمی تھے لیکن خان برادران کے والد اتنے با اثر تھے کہ ۱۹۱۹ء میں ان کے چھوٹے بیٹے کو گرفتار کر لینے کے بعد حکومت کو انھیں بھی جیل بھیجنا پڑا اس وقت ان کی عمر اسّی برس سے گذر چکی تھی۔

عبدالغفار خاں فرماتے ہیں کہ "آج بھی میرے ماں اور باپ دونوں میرے دل میں سچی مذہبیت کے بہترین مظہر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔ دونوں بے پڑھے تھے

لیکن دونوں دنیا دار نہیں بلکہ بڑے دیندار تھے۔ میری ماں اکثر نماز کے بعد مراقبہ کیا کرتی تھیں ان دونوں سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے ابتک میری نظر سے نہیں گزرے۔

میرے والد نے اپنی عمر میں بہت سے دوست پیدا کیے لیکن کسی کو دشمن نہ بنایا بعض قریب ترین عزیزوں اور رشتہ داروں کا نام تو میں نہ لونگا لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے بہت سے ایسے دشمن تھے جنھوں نے اپنی آخری عمر میں اپنے رویہ پر اظہار افسوس کیا اور پھر ایک وفادار دوست کی حیثیت سے مرے۔ ان میں انتقام کا جذبہ ذرا بھی نہ تھا۔ اور انکا عقیدہ تھا کہ دھوکا کھانے میں کوئی ذلت نہیں ہے دھوکا دینے میں ذلت ہے، وہ اپنی زبان کے سخت پابند تھے اور اتنے سچے تھے کہ ان کے دشمنوں کو بھی یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ ان کی بات کا اعتبار نہ کریں یا کسی معاملہ میں ان کی تردید کریں، سیکڑوں آدمی بلا کسی سید کے ان کے پاس اپنا روپیہ جمع کر جاتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ یہ ایک ایسا بنک ہے جس کا کبھی دیوالا نہیں نکل سکتا۔ وہ ارباب حکومت کی خدمت میں حاضری دینے کے قائل نہ تھے لیکن اس علاقہ کے بڑے بڑے سورما ان سے دہشت کھاتے تھے، اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری افسر انھیں "دچچا" کہکر پکارتے تھے اور انھیں کسی طرح ناخوش کرنا پسند نہ کرتے تھے۔

"انھوں نے کتنی عمر پائی" میں نے دریافت کیا "اور کیا انھیں ہماری جنگ آزادی سے کچھ دلچسپی تھی"

خان عبدالغفار خاں نے فرمایا کہ "انھوں نے ۱۹۲۶ء میں ۹۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس جنگ کے تمام نشیب و فراز کو سمجھتے تھے لیکن وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاح کے حامی تھے۔ پہلے زمانہ میں مولوی صاحبان ان لوگوں کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے جو اپنے لڑکوں کو تعلیم کی غرض سے انگریزی اسکولوں میں بھیجا کرتے تھے۔ لیکن میرے والد اتنے تنگ نظر نہ تھے۔ جب رولٹ بل کے خلاف جد و جہد شروع ہوئی تو میں بھی اس میں شریک ہو گیا۔ اس کے بعد ہی میں گرفتار ہوا۔ ۶ اپریل کو اُتمان زئی میں ایک جلسہ ہوا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی شریک ہوئے میرے والد بھی جلسہ میں موجود تھے۔ میری گرفتاری کے بعد اور بہت سے لوگوں کو پھانسنے کی کوشش کی گئی۔ پندرہ دن تک تو یہ بھی نہ تبلایا کہ میں کہاں ہوں اور میرا کیا حشر ہوا۔ پولیس افسر ایک جرگہ (وفد) لیکر میرے بوڑھے باپ کے پاس آئے اور طرح طرح سے اُنھیں ڈرایا۔ اُنھوں نے یہاں تک کہا کہ "بادشاہ کو گولی ماردی جائیگی"

میں نے حیرت سے پوچھا "بادشاہ سے کیا مطلب ہے؟"

خان عبدالغفار خاں نے ہنسکر کہا "ہاں اُس وقت میں بادشاہ ہی تھا۔ لوگ مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔"

میں نے کہا "اس پر مجھے 'پھودیوں کے بادشاہ' یاد آ گئے۔"

خان صاحب نے جواب دیا "یہ صرف آپ کا حسن ظن ہے۔ ان لوگوں کا مقصد صرف یہ تھا

کہ میرے والد کو ایک دھمکی دیں کہ مجھے بہت سخت سزا دیجائیگی"

"اچھا پھر کیا نتیجہ ہوا" میں نے اشتیاق سے پوچھا "نتیجہ یہ ہوا" خانصاحب نے فرمایا "کہ میرے والد بھی خاندان کے اور بہت سے افراد کے ساتھ گرفتار کر لیئے گئے"

"اس ضعیفی میں یہ گرفتاری تو بہت گراں گذری ہوگی"

"نہیں نہیں۔ وہ تو اس کے برعکس بہت ہی خوش ہوئے کہ اسی جیل میں آگئے جس میں میں تھا۔ مجھے دیکھکر بولے کہ "مجھے اس قید پر کتنی خوشی ہی! ورنہ شاید دنوں یا برسوں تک تم مجھے دیکھنے کو نہ ملتے"

"پھر وہ کتنے عرصہ تک جیل میں رہے"

"تین مہینے سے کچھ زیادہ۔ کیوں کہ بعد میں سرجارج رس کیپل نے پٹھانوں کے تالیف قلوب کی کوشش شروع کر دی۔ مجھے بھی چھ مہینے سے زیادہ جیل میں نہیں رہنا پڑا"

خان برادران کے والد نے ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔ انھیں اپنی تاریخ پیدائش کا علم نہ تھا لیکن اُن کے لڑکوں کا خیال ہی کہ اگر اُن کی عمر زیادہ نہیں تو سو برس کے لگ بھگ ضرور تھی۔ کیونکہ اُنھیں ۱۸۵۷ء کا غدر اچھی طرح یاد تھا۔ اُس وقت اُن کا عنفوان شباب تھا۔ پٹھانوں کی اس نازک زمانہ کی کارگذاری پر وہ کبھی فخر نہ کرتے تھے۔ یہاں پر احساس شرمندگی کے ساتھ دونوں بھائیوں نے ان واقعات کا تذکرہ کیا جو اُن کے والد بیان کیا کرتے تھے کہ کس خوبی اور بہادری سے اُنکے بڑے چچا نے چارسدہ کے خزانہ کے فوجی گارڈ

کی کمان کی تھی۔

"لیکن اس میں شرم کی کونسی بات ہے" میں نے ٹوکا "مجھے یاد ہے پنڈت موتی لعل جی بھی کہا کرتے تھے کہ ان کے والد اور چچا نے بھی غدر میں انگریزوں کی خدمات انجام دی تھیں"۔

"یہ صحیح ہے" ڈاکٹر خاں نے کہا "لیکن بہرحال سکھوں اور پٹھانوں نے جو کچھ کیا اُس کا تذکرہ کچھ خوشگوار نہیں معلوم دیتا"

"وہ زمانہ ہی اور تھا۔ لیکن کیا اس کی تلافی اس سے نہیں ہوتی کہ تاریخی روایات رکھنے والے یہ دونوں معزز خاندان آج جنگ آزادی میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں"

"بیشک"

اُس محبت اور عقیدت کا تذکرہ کئے بغیر میں یہ باب ختم نہیں کر سکتا جس کے ساتھ دونوں بھائی اپنے والد کا ذکر کیا کرتے ہیں، خصوصاً اُن کی بے انتہا خیر خیرات کا وہ خیرات جس میں شفقت اور دردمندی بھی شامل تھی یہ انھیں باپ کا فیض تھا کہ اُن کے بیٹوں کو عدم تشدد سے فطری عقیدت وراثت میں ملی ہے۔

باب سوم

ابتدائی حالات

اس کے بعد دونوں بھائیوں کی ابتدائی زندگی کا فسانہ شروع ہوتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنے کا بڑا اشتیاق تھا کہ اس تاریک صوبہ میں ان بھائیوں نے تعلیم کیونکر حاصل کی اور تحریک آزادی میں کیسے شریک ہوئے۔

خانِ عبدالغفار خاں نے کہا "میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہماری طرف اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنا خلاف شرع سمجھا جاتا تھا، البتہ مسجدوں میں مکتب ہوتے تھے انہیں مولوی قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے اور تھوڑی بہت مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ برطانوی دور کے شروع ہوتے ہی یہ مکتب تو بند ہو گئے لیکن ان کی جگہ بہت تھوڑے سے اسکول قائم ہوئے لوگ ان نئے اسکولوں کے بہت خلاف تھے لیکن میرے والد اتنے تنگ نظر نہ تھے۔ انھوں نے ہمیں پشاور کے مشن اسکول میں داخل کر دیا۔ میرے بھائی نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ ایک سال بمبئی کے گرانٹ میڈیکل کالج میں رہنے اس کے بعد ڈاکٹری کی تکمیل کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔ جب بھائی صاحب کو انگلستان بھیجنے کا مسئلہ پیش ہوا تو ہماری قوم میں بڑی واویلا ہوئی۔ لوگ یہ اندیشہ ظاہر

کرتے تھے کہ کہیں وہ عیسائی نہ ہو جائیں، یا وہیں سکونت اختیار نہ کرلیں یا کسی انگریز لڑکی سے شادی نہ کرلیں۔ آخری بات پوری بھی ہوئی۔ لیکن میرے والدان معاملات میں بڑے وسیع النظر تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اپنے لڑکوں کی تعلیم کے رستہ میں حائل ہونا نہیں چاہتا۔ بدقسمتی سے میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس نہ کرسکا۔ میرے انگلستان بھیجنے کے معاملہ پر بھی غور کیا گیا۔ لیکن اتفاق سے خاندان میں دو تین موتیں ہوگئیں اور یہ ایک بدشگونی سمجھی گئی۔ ان خانگی حادثات اور توہمات کی وجہ سے میرے دو قیمتی سال ضائع ہوئے تا آنکہ بھائی صاحب کے ایک انگریز لڑکی سے شادی کرلینے کی وجہ سے میرا انگلستان جانا ہمیشہ کے لیے ملتوی ہوگیا اور میری تعلیم یہیں ختم ہوگئی"

لیکن مشن سکول کی تھوڑے عرصہ کی تعلیم سے بھی چھوٹے بھائی کو بہت کچھ فائدہ ہوا۔ آج بھی دونوں بھائی اسکول کے پرنسپل ریورنڈ وگرام کو بڑی محبت سے یاد کرتے ہیں۔ جن کی سیرت اور نفس کشی نے انھیں شاگردوں میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ خان عبدالغفار خاں نے اپنے پرنسپل کو دیکھ کر اُسی زمانہ میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ بھی اسی طرح اپنی قوم کی خدمت کریں گے۔ ابھی انکے انگلستان جانیکا معاملہ بالکل ختم نہ ہوا تھا اور انھوں نے فوجی خدمت کے میدان میں قدم نہ رکھا تھا کہ انھیں فوج میں داخل ہونے کا شوق پیدا ہوا تاکہ ایک سپاہی کی حیثیت سے وہ نام پیدا کرسکیں۔ پٹھان تو پیدائشی سپاہی ہوتا ہی ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک رئیس خاندان کے فرد تھے، یہ چیز ان کے لیے اور بھی سفارش بنی اور ان کی درخواست منظور ہوگئی



مسز مے خانصاحب ۔ انکا بچہ جان ۔ اور ڈاکٹر خانصاحب

خانصاحب نے مجھ سے فرمایا کہ فوج میں داخل ہونے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا میری جان پہچان کے بہت سے لوگ عالی فوجی عہدوں پر ممتاز تھے اور میں دل ہی دل میں تصور کیا کرتا تھا کہ میں خاص طور پر اس کے لئے موزوں ہوں اور میں انگریزوں کی ہمسری کرسکوں گا۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا اتفاق سے میں اپنے ایک فوجی دوست سے ملنے گیا اور وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے یہ ذلت آمیز منظر دیکھا کہ ایک نیچ درجہ کے انگریز نے اس کی سخت توہین کی۔ بس وہیں میں نے طے کرلیا کہ فوج میں ہرگز داخل نہ ہونگا، اس کے بعد میں ایک سال تک علی گڑھ میں رہا۔ یہاں آکر اردو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ مولانا ظفر علیخاں کے روزنامہ اخبار زمیندار اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور ہفتہ وار اخبار الہلال کا جو افسوس کہ جنگ کے زمانہ میں بند کردیا گیا میں بڑے انہماک سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ سیاسیات سے میرا تعلق یہیں سے شروع ہوتا ہے اور قومی تعلیم سے مجھے اس وقت دلچسپی ہوئی جبکہ ۱۹۱۱ء میں صوبہ میں بہت سی قومی اسکول قائم کرنے میں میں نے خاص حصہ لیا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد ہماری خدمات کے صلہ میں رولٹ بل کا تحفہ ہمیں پیش کیا گیا اور مہاتما جی نے اس کے خلاف کارروائی شروع کی تو میں بلا تامل اس میں شریک ہوگیا۔ دوسرے صوبوں کی طرح ہمارے صوبہ میں بھی ایسی ہڑتالیں ہوئیں جن کی اس سے قبل نظیر نہیں ملتی، میں عرض کرچکا ہوں کہ اتمان زئی کے ۶۔ اپریل والے جلسہ میں جس میں تقریباً ایک لاکھ آدمی شریک ہوئے تھے میرے والد بھی موجود تھے اس وقت ستیہ گرہ کا کوئی ذکر بھی نہ تھا۔ لیکن اس جلسہ کا ہونا ہی

...وں کے لیے بہت کافی تھا۔ چنانچہ مجھے گرفتار کرلیا گیا مگر مقدمہ نہیں چلایا، گرفتاری سے پہلے مجھ سے دریافت کیا "کیا تم پٹھانوں کے بادشاہ ہو" میں نے جواب دیا "میں یہ نہیں جانتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ قوم کا خادم ہوں اور اس قسم کے قوانین کو خاموشی سے برداشت نہیں کرسکتا"۔ میرے پاس بھی ایک جرگہ آیا۔ اُسنے طرح طرح کی دھمکیاں دیں اور بہت سی سطحی دلیلیں پیش کیں، میں اُن میں ایک دلیل یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارے صوبہ میں جو قانون انسداد جرائم سرحد نافذ ہے وہ رولٹ بل سے کہیں بدتر ہے پھر اگر پٹھانوں کو اس قانون سے کوئی اختلاف نہیں ہے تو رولٹ بل کی احتجاجی تحریک میں کیوں شریک ہوتے ہیں، علاوہ ازیں دوسرے صوبوں نے کبھی پٹھانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا پھر پٹھان ان ناشکر گذار لوگوں کے لیے خطرے میں کیوں پڑیں؟ لیکن اِن دلیلوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں اپنے خیال پر قائم رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے کارکنوں کے ساتھ مجھے گرفتار کرلیا گیا"۔

میں نے اُسپر دریافت کیا کہ "اس پہلی قید کے دوران میں آپ کے ساتھ کیا سلوک ہوا"

"میں کوئی معمولی قیدی تو تھا نہیں" اُنھوں نے جواب دیا "بلکہ بڑا خطرناک مجرم تھا۔ ہتکڑیاں ڈال کر مجھے جیل لے گئے اور جب تک میں جیل میں رہا برابر میرے بیڑیاں پڑی رہیں، اُس زمانہ میں میرا جسم اب سے دوگنا تھا میرا وزن ۲۲۰ پونڈ تھا اس لیے میرے پاؤں میں کوئی بیڑی ٹھیک ہی نہ آتی تھی۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ میرے لئے کوئی خاص جوڑی تیار ہوئی

یا نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ میرے لیے بیڑیاں تلاش کرنے میں انھیں سخت پریشانی اُٹھانی پڑی اور بالآخر جب انھوں نے ایک جوڑی مجھے پہنائی تو میرے ٹخنے سے بہت خون نکلا۔ لیکن جیل کے افسروں کو بظاہر اس سے کوئی تردد نہیں ہوا اور وہ کہنے لگے کہ رفتہ رفتہ تم اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ اسی پر انھوں نے صبر نہ کیا بلکہ مجھ پر ایک سخت الزام لگانے کی ناپاک کوشش کی۔ میرے گاؤں کے ایک پٹھان کو ٹیلی گراف کے تار کاٹنے کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔ اُس سے دریافت کیا کہ تم عبدالغفار خاں کو جانتے ہو؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا اور کہا "انھیں کی تحریک پر میں اس جدوجہد میں شریک ہوا ہوں۔" اس پر اُس سے پوچھا کہ کیا انھیں نے تم کو تار کاٹنے کی ترغیب دی تھی لیکن اُس نے اسکی سخت تردید کی۔

"اس عرصہ میں آپ کے بڑے بھائی کیا کرتے رہے" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔ خانصاحب نے تبلایا کہ اُنھوں نے لندن کے سنٹ تھامس ہسپتال سے ایم۔ آر۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ اسکے بعد محاذ جنگ پر چلے گئے۔ جنگ کے بعد وہ ابھی فرانس ہی میں تھے کہ یہاں یہ تحریک شروع ہو گئی۔ اس زمانہ میں ان کو ہندوستان کا ایک خط بھی نہیں ملتا تھا، انھوں نے واپس آنے کی بھی کوشش کی لیکن چھ مہینے تک انھیں لندن میں انتظار کرنا پڑا۔ جب کہیں سنہ ۱۹۲۰ء میں انھیں واپسی کے احکام ملے گویا جس وقت ان کے والد۔ ان کے بھائی۔ اور ان کے دوسرے اعزہ جیل میں تھے اُسوقت فرانس میں وہ انگریزوں کی ملازمت کر رہے تھے اور جان بوجھ کر انھیں ان واقعات سے تاریکی میں رکھا جا رہا تھا۔ جب وہ وطن واپس آئے

تو بڑی مشکل سے انھیں استعفیٰ دینے کی اجازت ملی۔

غرض ڈاکٹر خاں تو نجی طور پر مطب کرنے لگے اور چھوٹے بھائی کو کانگریس اور کانگریس کے مقاصد سے برابر دلچسپی بڑھتی گئی ایک موقع پر دوران گفتگو میں مہاتما جی سے انھوں نے کہا تھا کہ "مصائب کی درسگاہ میں انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے، میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر میں کہیں عیش و آرام کی زندگی میں پڑ گیا ہوتا اور جیل کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ ملتا تو میری کیا کیفیت ہوتی میری پہلی اور دوسری اسیری واقعی میرے لیے ایک امتحان تھی، بعد کی سزائیں تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھیں، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ابتدا ہی میں میری اتنی سخت تربیت کی"۔

۱۹۲۰ء میں خان عبدالغفار خاں صاحب ناگپور کانگریس میں شریک ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں آپ تحریک خلافت میں بھی پیش پیش تھے، اور اپنے صوبہ کی خلافت کمیٹی کے صدر تھے، لیکن بعد میں آپ نے اس سے استعفےٰ دیدیا۔ مہاجرین کی ایک بہت بڑی جماعت بھی آپکی قیادت میں افغانستان گئی تھی جسے جانے اور پھر واپس آنے کے سلسلہ میں ناقابل بیان مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر خانصاحب فرماتے ہیں کہ میرے ضعیف والد بھی ہجرت کرنے پر سخت مُصر تھے حالانکہ اُن کی عمر اسوقت نوّے برس کے قریب تھی میں نے انھیں روکا اور التجا کی کہ اپنی ضعیف العمری کے خیال سے نہ سہی کم از کم اپنی آبائی جائداد ہی کی خاطر اس ارادے کو ملتوی کر دیں۔ اُن کے قوی ہم دونوں سے زیادہ مضبوط تھے اور اس عمر میں بھی وہ دُور دُور تک پیدل

چل سکتے تھے، غرض بڑی مشکل سے میں اُنھیں اس ارادہ سے باز رکھ سکا" مجھے ہجرت کے افسوسناک واقعہ کی تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میرے نزدیک تو یہ صرف اُن ضعیف والدین کے جوان ہمت اراددں اور خان عبدالغفار خاں اور اُن کے ہمسفر بھائیوں کے مصائب کی حد تک قابل ذکر ہے اور بس۔

۱۹۲۱ء میں قانون انسداد جرائم سرحد کی ضمانت والے دفعہ ۴۰ کے ماتحت خان عبدالغفار خاں پھر جیل بھیجدیئے گئے یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ ناگپور کانگریس سے واپس ہوتے ہی اُنھوں نے تعمیری کام کی اس طرح بنیاد ڈالی کہ اپنے موضع اتمان زئی میں ایک قومی اسکول کھولا اور صوبہ بھر میں اُس کی شاخیں قائم کرنے کی کوشش شروع کردی۔ اس وقت سول نافرمانی کا تو ذکر ہی نہ تھا اس لیے تعمیری پروگرام کا یہ شعبہ انھیں بہت پسند آیا اور انھوں نے اپنی ساری کوششیں اس کی تکمیل کے لیئے وقف کردیں۔ افسروں کو بدحواس کرنے کے لیے یہ بھی کافی تھا۔ چنانچہ اضلاع میں ان کا دورہ کرنا گوارا نہ ہوا اور ان سے ضمانت طلب کی گئی، ظاہر ہے کہ اس کے داخل کرنے سے انھوں نے انکار کردیا۔ سرجان میفی چیف کمشنر نے ان کے والد کو اس امر کی ترغیب دی کہ وہ اپنے لڑکے کو اسکول بند کردینے پر آمادہ کریں انھوں نے بوڑھے خاں کو اس طرح سمجھایا کہ "یہ حرکت تو انگریزوں کے خلاف ہے جب کوئی اور شخص اس کام میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے تو آپ کا لڑکا ہی کیوں اسکول قائم کرے"۔ اسپر انھوں نے عبدالغفار خاں سے تذکرہ کیا اور عبدالغفار خاں نے کچھ اس انداز سے جواب دیا

کہ اُن کے دل کو لگ گیا۔ اُنھوں نے کہا "ابّا۔ فرض کیجیے لوگ نماز پڑھنا چھوڑ دیں تو کیا آپ مجھ سے یہ فرمائیں گے کہ میں بھی نماز نہ پڑھوں اور اپنے فرض سے پہلوتہی کروں، یا آپ یہ ہدایت فرمائیں گے کہ نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو میں اپنا مذہبی فرض ادا کرتا رہوں"۔

"ہرگز نہیں" والد نے جواب دیا "دوسرے چاہے کچھ بھی کریں میں تم سے مذہبی فرائض ترک کرنے کے لیے کبھی نہ کہونگا"۔

"بس یہی سمجھ لیجیے" عبدالغفار خاں نے کہا "قومی تعلیم کا کام بھی ایسا ہی ہے، اگر نماز قضا کرنا صحیح ہو تو اسکول بند کرنا بھی صحیح ہو سکتا ہے"۔

"ہاں اب میں سمجھا" والد نے کہا "تم بالکل سچ کہتے ہو۔ تم اپنا کام شوق سے جاری رکھو"

اس طرح سرجان میفی کی ترکیبیں خاک میں مل گئیں۔ بالآخر خان عبدالغفار خاں کو اس جرم میں کہ وہ پٹھان لڑکوں کو قومی تعلیم دینا چاہتے تھے تین سال قید بامشقت کی سزا دی گئی ۱۹۱۹ء کی اسیری سے جو تزکیہ شروع ہوا تھا اس مرتبہ کی سختیوں نے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اس کا افسانہ بڑا دردناک ہے۔ قید تنہائی۔ چکی کی مشقت مہینوں تک متواتر بیڑیاں غرض کہ کون سی وہ سختی تھی جو اُن کے ساتھ روا نہ رکھی گئی، ان مصائب کا اثر یہ ہوا کہ وہ بہت کمزور ہو گئے ۵۵ پونڈ وزن گھٹ گیا اور درد کمر اور فساد خون کے مستقل مرض لاحق ہو گئے لیکن جیسے جیسے مصیبتوں اور آزمائشوں میں اضافہ ہوا انکا جوش عمل تیز تر ہوتا گیا۔ اس جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تہدید اور ترغیب کی دونوں ترکیبیں وقتاً فوقتاً استعمال کی گئیں لیکن سب

ناکام ثابت ہوئیں۔ ایک مرتبہ سرجان میفی نے خان بہادر عبدالرحیم خاں کو یہ پیغام لیکر آپ کے پاس بھیجا کہ اُتمان زئی کے اسکول پر اُنھیں کوئی اعتراض نہیں ہے اور وہ خانصاحب کو فوراً رہا کرنے کو تیار رہیں بشرطیکہ خانصاحب یہ وعدہ کریں کہ دیہات میں دَورہ نہ کریں گے۔ یہ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ خانصاحب نے اس پیشکش کو بلا تامل ٹھکرا دیا۔

میں اس اسیری کے اخلاقی اور روحانی پہلو پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان کی جیل کی زندگی کے چند واقعات سُنے ہیں اور میں نہ صرف انکی ہمت و جرات بلکہ انکے قابل تقلید رویّہ کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ وہ ایک ایسے قیدی تھے جو نظیر کے طور پر پیش کیئے جا سکتے ہیں۔ اُنھوں نے کبھی جیل کے ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں کی مراعات کی نہ کبھی توقع کی نہ انھیں قبول کیا اور اپنے کسی اصُول کو نہیں توڑا۔ اکثر ایسے افسر بھی تھے جو ان کے ساتھ رعایت کرنا چاہتے تھے اور ضابطہ کے ماتحت ان پر جو سختیاں اور پابندیاں عائد ہونا چاہیئے تھیں ان میں اپنے فرائض کو نظر انداز کر کے کمی کرنے کو تیار تھے۔ لیکن آپ خود اُن سے درخواست کرتے تھے کہ وہ اس قسم کی کوئی رعایت نہ کریں۔ بہت سے قیدی وارڈر خوشی سے آپ کا کام کرنے کو تیار ہو جاتے تھے یا دوسری ترکیبوں سے آپ کو مشقت سے بچانا چاہتے تھے لیکن آپ نہایت نرمی سے انہیں بتلا دیتے تھے کہ "دیکھو میں تم سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ میں جھوٹ ہرگز نہ بولوں گا" جیلوں میں بہت سی چھوٹی چھوٹی بے عنوانیاں ہوا کرتی ہیں، مثلاً یہ آسانی سے ممکن ہے کہ رشوت دیکر سزا میں تخفیف کرالی جائے یا کم از کم مشقت سے

چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ آپ ان حرکتوں سے نفرت کرتے تھے اور اگر کسی قیدی کو ایسا کرتے دیکھتے تو اُسے سمجھاتے تھے کہ اس سے باز رہے۔ آپ سپاہیوں کو نصیحت کرتے تھے کہ اپنے ہاتھ اس قسم کی گندگیوں میں آلودہ نہ کریں۔ ایک دفعہ ایک شخص نے بڑے دردناک لہجہ میں آپ سے کہا "پھر میں کیا کروں۔ اس کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا" خانصاحب نے فرمایا "یہ میں نہیں کہونگا کہ تمھیں کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ ضرور کہونگا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ غلط ہے اور گناہ ہے" اسکا یہ اثر ہوا کہ اُس شخص نے استعفیٰ داخل کر دیا۔ افسر بھلا یہ چیز کب برداشت کر سکتے تھے۔ اس واقعہ کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں ہو سکتی لیکن اُنھوں نے اسے بھی سیاسی رنگ دیدیا۔ اگرچہ یہ خانصاحب کا محض اخلاقی اثر تھا لیکن جیلخانہ میں بھلا یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا چنانچہ انھیں سرحد سے پنجاب کی جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں خوش قسمتی سے انھیں دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی یہ قابل تقلید قیدی اپنی با اُصول زندگی کی مثال اپنے ساتھ لایا۔ صوبہ سرحد میں جیل کے افسر جو چیز برداشت نہ کر سکتے تھے۔ پنجاب کی جیل میں آپ کے ساتھی بھی اس کی قدر نہ کر سکے۔ لیکن آپ نے اپنا رویّہ بدلنا تھا نہ بدلا۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ "اگر کبھی کسی نے اپنا اُصول توڑ دیا تو گویا اُسنے سچائی کی تذلیل کی بلکہ یوں کہئے کہ اپنی خودداری کو فنا کر دیا۔ چنانچہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ جیل میں ناجائز طور پر مختلف چیزیں منگانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے بالآخر وہ اپنی خودداری کو خیرباد کہدیتے ہیں"۔ بہرحال پنجاب جیل کا

یہ تجربہ بھی روحانی حیثیت سے آپ کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔

آپ نے وہاں سکھ اور ہندو دوستوں سے مستقل تعلقات پیدا کیے اور اُن کے مذہب اور تہذیب و تمدن کا مطالعہ شروع کیا اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے گیتا سب سے پہلے یہیں پڑھی۔ اس کے علاوہ میں نے گرنتھ صاحب اور انجیل بھی پڑھی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی دوستی کا کم از کم اتنا حق مجھ پر ضرور تھا کہ میں ان کی مذہبی کتابیں پڑھ لوں، کیونکہ اگر مجھے ان کی مقدس کتابوں کے متعلق کوئی علم نہ ہو تو میں ان کے خیالات اور انکے جذبات کو پوری طرح کیسے سمجھ سکتا ہوں اور اُن کی دوستی کی کیسے قدر کر سکتا ہوں مجھے تسلیم ہے کہ اسوقت گیتا میری سمجھ سے باہر تھی میں نے اُسے بار بار پڑھا۔ شاید اسوقت مجھ میں اتنی استعداد نہ تھی کہ میں اُسے سمجھ سکتا۔ مجھے تو ۱۹۳۰ء میں انڈمان کے پنڈت جگت رام نے باقاعدہ گیتا پڑھائی انھیں اس سے خاص شغف تھا اور انھیں نے مجھے اسکا صحیح مفہوم سمجھایا۔

ان کے قدر دان محبت سے اور مخالف طنز سے انھیں سرحدی گاندھی کہتے ہیں۔ یہ خطاب بھی در اصل اُسی زمانہ سے شروع ہوا۔ انھوں نے مہاتما جی کی سوانح حیات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا اور ہمیشہ ان کی پیروی کیا کرتے تھے جیل خانہ میں وہ نہ صرف ہفتہ میں ایک دن روزہ رکھا کرتے تھے بلکہ ایک دن مون برت بھی رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا یہ خطاب پڑ گیا حتیٰ کہ بعض متعصب مسلمان انھیں ہندو کہنے لگے، جیسے بعض کٹر سناتنی مہاتما جی کو طرح طرح سے بدنام کرنے میں تامل نہیں کرتے۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک قومی تحریک کا تاریک ترین زمانہ تھا جبکہ ہندو مسلم کشیدگی انتہا پر تھی۔ لیکن اس وقتی ہنگامہ کا خانصاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آپ تمام فرقہ وارانہ سرگرمیوں سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ کسی خاص واقعہ کا اظہار کیے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ آپکی زندگی میں اکثر ایسے مواقع پیش آئے جب آپ نے اس بڑھتے ہوئے طوفان کے ساتھ بہنے سے قطعی انکار کر دیا۔ خان عبدالغفار خاں نے ایک مرتبہ مجھ سے انتہائی جوش سے کہا "میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں کسی مذہب کی سچائی کا اندازہ اُس کے ماننے والوں کی تعداد سے نہیں بلکہ اُن کے عمل سے کرتا ہوں، کیونکہ وہ مذہب کیا جو انسان کے عمل سے ظاہر نہو۔ میرا عقیدہ ہے کہ عمل۔ ایمان اور محبت کا نام اسلام ہے، ان کے بغیر اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے تو گویا خالی ٹکریں لگانے کے برابر ہے۔"

خان عبدالغفار خاں کسی پکّے سے پکّے مسلمان سے کم نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کبھی ان کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ اور ان میں اخوت کا جذبہ بہت سے کٹر مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ بڑے بھائی عرصہ تک دوسرے ملکوں میں رہے ہیں اور مختلف قوموں اور مختلف عقیدے کے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ اس لئے وہ معقول پسند شخص ہیں یعنی ہر مذہب کی اچھی باتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے والد کی مذہبیت کا اثر جتنا اُن کے چھوٹے بھائی پر ہے اتنا ہی ان پر بھی ہے۔ اکثر وہ مذاقاً کہا کرتے ہیں کہ میرے بھائی میرے بدلے کی نماز بھی پڑھ لیتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی کسی مذہب کے متعلق انہیں کسی ایسی بات کا علم ہوتا ہے جس میں

تنگ نظری کا سبب ...... سخت صدمہ پہنچتا ہے ایک دن میں نے ان بھائیوں کو ایک متعصب مسلم ہفتہ وار اخبار کا تراشہ دکھایا جس میں اس نے مہاتماجی کے برت پر اعتراض کیا تھا میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آیا اسلام میں صرف اُسی خاص قسم کے روزہ کی اجازت ہے، جیسے مسلمان عموماً رکھتے ہیں یا اور کسی طرح کے روزہ کی بھی اجازت ہے، اس پر انھوں نے دریافت کیا کہ پہلے تو یہ بتائیے کہ خاص قسم کے روزہ سے کیا مطلب ہے میں نے انہیں بتایا کہ اس اخبار کے نزدیک تو ہی روزہ روزہ ہے جس میں سارے دن ہر قسم کے کھانے پینے سے پرہیز کیا جائے اور صرف سورج غروب ہونے کے بعد سے طلوع ہونے کے قبل تک کھایا پیا جائے۔

اس پر چھوٹے بھائی نے کہا[1]۔ جب پچھلے اگست میں مہاتماجی نے سات دن کا برت رکھا ہے تو خود میں نے بھی سات دن تک روزہ رکھا تھا اور شام کو صرف نمک ملا ہوا پانی پیتا تھا۔ یہ کہنا تنگ نظری ہے کہ عام طور پر جس طرح مسلمان روزہ رکھتے ہیں وہی صحیح روزہ ہے ہمارے رسول اکرم نے اکثر دن اور رات متواتر روزے رکھے تھے میرا خیال تو یہ ہے کہ آنحضرت نے محض انسانی کمزوریوں کا لحاظ کر کے غروب آفتاب کے بعد کھانے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ شریمتی مہادیو دیسائی کو خان صاحب کا مفہوم سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔ قرآن شریف کے مطابق مسلمانوں کے لیے اس قسم کے روزے کا حکم ہے لیکن اگر کوئی شخص ریاضت کے طور پر مسلسل اور متواتر دن رات نہ کھائے پیئے تو اس کو گناہ گار نہیں کہا جا سکتا۔

پینے کی اجازت دے دی ہی۔ آنحضرت کو کسی غذا کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ان کا
قول تھا کہ اللہ تعالیٰ انھیں روحانی غذا بھیجتا ہی۔ عام انسانوں کو یہ غذا نہیں مل سکتی
کیوں کہ ان میں اس ایمان کی کمی ہوتی ہی جو اس کے لئے ضروری ہی۔

اس اخبار کا اعتراض بھی ایسا ہی ہی جیسے لوگ مجھے ہندو کہنے لگے تھے۔
کیوں کہ میں ہفتے میں ایک دن مون برت رکھتا تھا اور گیتا پڑھا کرتا تھا۔

باب چہارم

مذہبی خیالات

میں اس باب میں خان برادران کے مذہبی خیالات بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہندو اور مسلمان یہ سمجھ سکیں کہ ان کی کامیابی کا راز کیا ہے اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے اتنے زبردست حامی کیوں ہیں۔

اتفاق سے ایک مرتبہ گاندھی جی نے ڈاکٹر خانصاحب کی انگریز بیوی کے متعلق ان سے دریافت کیا کہ آیا وہ مسلمان ہوگئی ہیں یا نہیں۔ اس پر چھوٹے بھائی نے کہا "آپ کو تعجب ہوگا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان ہیں یا عیسائی اتنا مجھے معلوم ہے کہ انھیں کبھی باقاعدہ مسلمان نہیں کیا گیا۔ انھیں اس کی پوری آزادی حاصل ہے کہ انکا جو عقیدہ ہو اس کی پیروی کریں۔ میں نے کبھی اس معاملہ میں ان سے بات چیت ہی نہیں کی۔ اور میں کرتا بھی کیوں؟ آخر خاوند اور بیوی اپنے اپنے مذہب کے کیوں نہ پابند رہیں اور شادی تبدیلی مذہب کا باعث کیوں ہو۔ آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ میرے بھائی کے لڑکے نے جس نے ابھی لندن میٹرکیولیشن کا امتحان پاس کیا ہے اور عنقریب آکسفورڈ جانے والا ہے ایک خط میں لکھا تھا کہ

یہاں لڑکے مجھے عیسائی سمجھتے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ ان سے کیا کہوں۔"

"اچھا" گاندھی جی نے بہت تعجب سے کہا "آپ نے اپنی بھاوج کے متعلق جو کچھ کہا اس سے مجھے حیرت ضرور ہوئی لیکن مجھے یہ بات پسند بھی آئی۔ مگر اور مسلمانوں کا کیا خیال ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ بہت سے لوگ آپ کے ہم خیال نہ ہوں گے۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے ہم خیال نہیں ہیں لیکن یہ تو کوئی بات نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ لاکھوں میں ایک مسلمان بھی مشکل سے اسلام کا صحیح مفہوم سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے سارے جھگڑوں کی جڑ یہی ہے۔ اور دونوں فرقوں کے وہ لوگ جو ان جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ہمیشہ جذبات اور تعصب کی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ صد افسوس کہ ہم ذلت کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔

"سنہ ۱۹۳۰ء میں جب میں گجرات جیل میں تھا تو میں نے طے کیا کہ ہندو بھائیوں سے تعلقات پیدا کروں۔ اس مقصد کے پیش نظر یہ طے پایا کہ گیتا اور قرآن شریف کے درس کا انتظام کیا جائے اور تدریس کی خدمت ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اس کی پوری اہلیت رکھتے ہوں۔ کچھ عرصہ تک تو یہ درس جاری رہا لیکن بعد میں پڑھنے والے نہ ہونے کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ گیتا کے درس میں تنہا میں رہ گیا تھا اور قرآن شریف کے درس میں ایک اور ہندو دوست

تھے۔ جن کا نام اب مجھے یاد نہیں رہا۔ ہم دونوں پر خوب لعن طعن ہوئی۔ مجھے تو لوگ ہندو کہتے تھے اور انھیں مسلمان۔ لیکن میں نے گیتا پڑھنا ترک نہ کیا۔ اب تک میں نے تین بار گیتا پڑھی ہے۔ میرے نزدیک ہمارے جھگڑوں کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ ہر مذہب اپنے پیروؤں کے لئے کوئی پیغام لایا ہے۔ قرآن شریف میں صاف صاف لکھا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہر قوم میں ہادی بھیجے ہیں اور وہ سب اہل کتاب ہیں۔" "لیکن عام مسلمانوں کا تو یہ خیال نہیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور ان کی مقدس کتابوں کے نام انھیں قرآن شریف میں نہیں ملتے۔ قرآن شریف میں جو نام درج کئے گئے ہیں وہ محض تمثیلی ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں۔ ان کے پیغمبروں اور ان کی مقدس کتابوں کی مکمل فہرست تو مرتب نہیں کی گئی ہے۔ قرآن شریف میں صرف ایک اصول درج کیا گیا ہے یعنی جن لوگوں پر کتاب نازل ہوئی ہے وہ اہل کتاب ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس آیت میں وہ تمام قومیں آجاتی ہیں جن کی ہدایت کے لئے کتاب نازل ہوئی ہو۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ دنیا کے تمام مذاہب کے بنیادی اصول یکساں ہیں۔ البتہ فروعات میں فرق ہے کیونکہ ہر مذہب میں اس ملک کی رنگ و بو ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی۔

"مثلاً۔ ایک سادی سی مثال لیجئے اسلام اور ہندو دھرم دونوں

میں صفائی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ صفائی کے مسئلہ میں ان دونوں میں کوئی فرق ہے نہ ہو سکتا ہے۔ لیکن عمل میں تھوڑا فرق ہے۔ اسلام میں خشک مسواک کرنے کا حکم ہے اور ہندو دھرم میں سبز داتون کا۔ اسلام میں جب غسل واجب ہو اس وقت غسل کرنے کا حکم ہے لیکن ہندو دھرم میں روزانہ یا دن میں کئی بار اشنان کرنا لازمی ہے۔ ان باتوں سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی کہ ہندو دھرم نے دوآبہ میں جنم لیا جہاں پانی کی افراط تھی اور اسلام ایک ایسے ریگستان سے شروع ہوا جہاں اکثر کئی کئی دن تک ایک قطرہ پانی بھی نہیں ملتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اگر کوئی مسلمان روز غسل کرے یا سبز مسواک کرے تو اسلام سے خارج ہے۔ عمل کے معاملہ میں مختلف مذاہب میں جو فرق ہے اس سے محض مقامی حالات کے اختلاف کا پتہ چلتا ہے۔ کوئی اصولی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے میں کسی مذہب میں کیوں دخل دوں۔ یہ تو کبھی ممکن نہ ہوگا کہ ساری دنیا کا ایک مذہب ہو جائے۔ ہر قوم بہر حال اپنے ہی مذہب سے ہدایت حاصل کرے گی اس لیے ایک قوم کا دوسری قوم کے مذہب میں دخل دینا بے کار ہے۔"

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان دونوں بھائیوں کے نزدیک ہر قوم کو بالکل الگ تھلگ رہنا چاہئے۔ اگر کوئی یہ رائے قائم کرے تو سخت غلطی ہے وہ بار

بار کہا کرتے ہیں کہ اسٹیشنوں پر "ہندو پانی" اور "اسلامی پانی"، "ہندو چائے" اور "اسلامی چائے" کی صدائیں سن سن کر ہمارا دل جلتا ہے۔ آخر کسی ہندو یا مسلمان کو ایک دوسرے کے صاف برتن کا پانی پینے میں کیوں اعتراض ہو؟"

لیکن اور دوسرے معاملوں کی طرح اس میں بھی جبر واکراہ کا کوئی سوال نہیں ہے اور خان عبدالغفار خاں کی طرح نہ کوئی اس کی نزاکت کو محسوس کرتا ہے نہ اس کا عامل ہے۔ ۱۹۲۲ء میں خانصاحب ڈیرہ غازی خاں جیل میں تھے۔ وہاں کا مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں اس لئے اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اندازہ ہوسکے کہ خاں صاحب دوسروں کے جذبات کا کتنا لحاظ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ان قیدی بھائیوں کے خیال سے جو گوشت نہیں کھاتے تھے کوئی چھ ماہ سے خود بھی گوشت ترک کر دیا تھا۔ ان کی صحت پر اس کا خراب اثر پڑا۔ اور ڈاکٹروں نے انھیں مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے دانتوں کی خیر چاہتے ہیں تو دال ترکاری کے ساتھ گوشت ضرور کھائیں۔ انھوں نے بہت کچھ تامل کے بعد اسے منظور کرلیا۔ اب یہ مشکل درپیش ہوئی کہ آخر گوشت پکایا کہاں جائے۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ عام باورچی خانہ میں پکاؤ۔ لیکن خاں صاحب نے جواب دیا کہ عام باورچی خانہ میں گوشت پکا کر اپنے گوشت نہ کھانے والے بھائیوں کے جذبات

کو ٹھیس پہنچانے سے تو میں یہی بہتر سمجھوں گا کہ گوشت نہ کھاؤں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے ایک دوسرے باورچی خانہ میں انھیں کھانا پکانے کی اجازت دیدی۔ خاں صاحب اپنے دوستوں کے جذبات کا اتنا پاس کرتے ہیں کہ جب ۱۹۳۱ء میں شریمتی دیوی داس جی گاندھی ان کے یہاں مہمان گئے تو انھوں نے اپنے گھر میں حکم دیدیا تھا کہ گوشت ہرگز نہ پکے۔ دوسری طرف آپ کا یہ بھی فرمانا ہے اور بالکل صحیح ہے کہ اسی طرح ہندوؤں کو بھی چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات اور ان کی روایات کا پاس کریں۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب طبّی مشورے کے مطابق ۱۹۲۲ء میں خاں صاحب نے دوبارہ گوشت کھانا شروع کیا تو بعض سکھ اور ہندو دوست اسے برداشت نہ کر سکے یہی عدم رواداری ہماری بدنصیبی کا باعث ہے۔ چنانچہ خاں صاحب نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ "جب تک ہم ایک دوسرے کے جذبات کا پاس کرنا نہ سیکھیں گے ہندو مسلم اتحاد ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

موجودہ حالات خواہ کتنے ہی ہمت شکن ہوں اور موجودہ منظر خواہ کتنا ہی تاریک ہو لیکن ہندو مسلم اتحاد پر انھیں غیر فانی عقیدہ ہے۔ انھیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ایکدن یہ ہو کر رہے گا۔ اور دونوں قوموں کے رہنماؤں کو اس کوشش میں اپنا سب کچھ قربان کرنا پڑے گا۔

چھوٹے بھائی نے ایک مرتبہ مجھ سے تذکرہ کیا کہ "ایک جگہ ایک مسجد کے مولوی صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کرنے کے سلسلہ میں میری خوب خبر لی اور فرمایا کہ یہ سعی لاحاصل ہے ہندو تو بت پوجتے ہیں۔ پھر ہم اُن سے کوئی تعلق کیسے رکھ سکتے ہیں۔ تمہارا یہ فعل اسلامی تعلیم کے خلاف ہے" اس پر فوراً میں نے انھیں ٹوکا اور کہا کہ اگر وہ بت پرست ہیں تو ہم کون سے بہتر ہیں؟ آخر یہ قبر پرستی کیا ہے؟ اور وہ خدا پرست کیوں نہیں ہیں جب کہ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی ایک خدا کو مانتے ہیں؟ علاوہ ازیں ہندو مسلم اتحاد سے ہم کیوں مایوس ہوں جب کہ دنیا میں کوئی کوشش بیکار نہیں جاتی؟۔ ذرا سامنے کھیتوں پر نظر ڈالئے۔ ہم جو دانے بوتے ہیں وہ کچھ عرصہ تک زمین کے اندر دبا رہتا ہے۔ پھر اس میں سے نکلتے پھوٹتے ہیں۔ پھر ایک مقررہ مدت کے بعد وہ پھل لاتا ہے اور اس میں سے ایسے ایسے سینکڑوں دانے نکلتے ہیں کسی نیک مقصد کے لئے اگر ہم کوشش کریں تو یہی حال اس کا بھی ہوتا ہے"

ایک دوسرے موقع پر ایک مسلمان اڈیٹر یہی مسئلہ لے کر ان کے پاس آئے لیکن دلیل مختلف تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ "آپ ریت میں کیوں ہل چلاتے ہیں۔ ان ہندوؤں پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ کیا آپ شیواجی کو بھول گئے؟" اس پر بڑے بھائی نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا اور کہا "اچھا۔ گویا اپنے نزدیک

شیواجی کو تو آپ جانتے ہیں لیکن اگر کوئی ہندو اورنگ زیب کو برا بھلا کہے اور یہ دلیل پیش کرے کہ اسی بنا پر مسلمانوں پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے تو پھر آپ کے پاس کیا جواب ہوگا۔ عزیز من۔ شیواجی اور اورنگ زیب تو مدتوں کے مر چکے۔ اس لئے اب ہمیں ان کی فکر نہ کرنا چاہیئے۔ یہ بتائیے۔ مہاتما گاندھی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ اگر آپ ان پر اعتماد کر سکتے ہیں تو بس ٹھیک ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اگر ہم خود قابل اعتماد ہیں تو ہندوؤں سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو۔ ہمیں کسی قوم کے متعلق اس کے چند بُرے نمونے دیکھ کر رائے نہیں قائم کرنا چاہیئے بلکہ اس کی بہترین شخصیتیں لینا چاہیئے ''

ایک مرتبہ چھوٹے بھائی نے مہاتما جی سے کہا ''مہاتما جی! ہم نے آپ کی ہریجن تحریک کے متعلق بھی طرح طرح کے شکوک سُنے ہیں۔ آپ کے ۲۱ دن کے برت اور یروودہ کے معاہدے کے متعلق بھی غلط فہمیاں ہیں اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ بھی فرقہ پرست ہو گئے۔ ہم نے اس قسم کے اعتراضات کی کبھی تائید نہ کی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ تحریک انسانی خدمت کے خالص جذبہ پر منحصر ہے۔ کسی مذہب کے نام لیواؤں کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے دوسرے ہم مذہب بھائیوں کو اچھوت سمجھیں۔ آپ کو یاد ہوگا ہم نے جیل سے آپ کو مبارکباد کا تار بھیجا تھا۔ آپ نے جواب بھی دیا تھا لیکن جیل کا راستہ شاید اتنا دور تھا کہ ہمارے پاس پہنچتے پہنچتے اسے

کافی وقت لگا۔" اس پر دونوں خوب دل کھول کر ہنسے۔

انھوں نے نہ صرف مہاتماجی کے روزوں کا احترام کیا بلکہ گوشت چھوڑنے کا بھی عزم کرلیا اور اس کے بعد سے جب تک جیل میں رہے کبھی گوشت کو ہاتھ نہ لگایا۔ جیل سے باہر نکلنے پر بھی انھوں نے یہ طریقہ جاری رکھا۔ ہاں کبھی کبھی جب وہ بغیر اطلاع کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور گوشت تیار ہوتا ہے تو خیر کھانے بیٹھ جاتے ہیں۔ چھوٹے بھائی نے مہاتماجی کے گذشتہ برت کے موقع پر نہ صرف ساتھ ساتھ روزہ رکھا بلکہ اپنی نفس کشی میں ایک چیز کا اور اضافہ کیا۔ وہ چائے کے بہت عادی تھے لیکن اسے بھی انھوں نے چھوڑ دیا۔ ایکدن انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ "میں چائے کا اتنا عادی تھا کہ جب کبھی میں چائے نہ پیتا تو میرے سر میں درد ہونے لگتا۔ تعجب ہے کہ روزوں میں مجھے اس کی طلب نہیں ہوتی۔ اس لئے میں نے بڑی آسانی سے اسے ترک کر دیا۔" لیکن بہ تقاضائے فطرت بڑے بھائی کو اپنے چھوٹے بھائی کی صحت کا بہت خیال رہتا ہے۔ وہ اکثر ان کی انتہائی نفس کشی کے خلاف احتجاج کیا کرتے ہیں کیونکہ جہاں ان کا وزن ۱۹۱۹ء میں ۲۲۰ پونڈ تھا اب صرف ۱۷۰ پونڈ رہ گیا ہے۔ دراصل یہ نذرانہ انھیں جیل کی بھینٹ چڑھانا پڑا۔

لیکن میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اسلام کا دائرہ انکے نزدیک

محدود نہیں ہے۔ اس لئے انھیں کامل یقین ہو کہ جتنا زیادہ کوئی شخص پکا مسلمان ہوتا اتنا ہی اسے ہندو مسلم اتحاد اور کانگریس کا پکا حامی ہونا چاہیئے ۱۹۴۰ء کے ایک جلسہ میں انھوں نے فرمایا تھا "مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کانگریس کے نام ہی سے میرے بعض مسلمان بھائی بھڑکتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس کوئی ہندو جماعت ہو۔ اس لئے انھیں اس سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہیئے۔ کسی جماعت کے متعلق اس سے زیادہ غلط بیانی اور کوئی ہو نہیں سکتی کیونکہ یہ تو حقیقت میں ایک قومی جماعت ہے۔ میں اپنے بھائیوں سے درخواست کرونگا کہ وہ کانگریس کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط کا مطالعہ کریں۔ مختصراً کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو غلامی اور لوٹ سے بچائے۔ یا بالفاظ دیگر ہندوستان کے لاکھوں بھوکوں کا پیٹ بھرے اور ننگوں کا تن ڈھانکے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اسلام کی تاریخ پڑھیں اور غور کریں کہ آنحضرت کیا پیغام لے کر آئے تھے۔ کیا ان کا یہ مقصد نہ تھا کہ مظلوموں کو آزاد کیا جائے۔ بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھانا بہم پہنچایا جائے اور ننگوں کو کپڑا مہیا کیا جائے کانگریس بھی آج وہی کام کر رہی ہے جو اسلام نے شروع کیا تھا۔ اس لئے کانگریس کے مقاصد اسلام کے برعکس یا منافی کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ چیز مجھے اتنی صاف نظر آرہی ہے جیسے سورج کی روشنی میں ہر چیز

دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان کانگریس سے کیسے علحدہ رہ سکتے ہیں۔ اب ذرا عدم تشدد کے مسئلہ پر غور کیجئے۔ کوئی تعجب نہیں اگر مجھ جیسا مسلمان یا پٹھان اس کا حامی ہو جائے۔ یہ کوئی نیا مسلک نہیں ہے۔ آج سے چودہ سو برس پہلے آنحضرت نے مکہ معظمہ میں خود اس پر عمل کیا تھا۔ اس کے بعد ہر وہ قوم جس نے غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکنا چاہا۔ اس پر عمل کرتی رہی ہے۔ لیکن ہم اسے اتنا بھول گئے تھے کہ جب مہاتما جی نے اسے ہمارے سامنے پیش کیا تو ہم یہ سمجھے کہ یہ کوئی نیا مسلک یا نیا ہتھیار ہے۔ مہاتما جی کو صرف اتنا ہی فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے ایک بھولی ہوئی چیز کو ہمیں یاد دلایا اور ایک قوم کی مصیبتوں کی تلافی کے لئے اس پر عمل کیا۔

ہندو اور مسلمان۔ دونوں سے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ جنگ تو دونوں کی آزادی کے لئے ہے۔ ہندو اگر اس جنگ میں شریک ہوں تو وہ کسی پر احسان نہیں کرتے اور مسلمان اگر ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کریں تو وہ بھی کسی پر احسان نہیں کرتے۔ آج ہم میں پھوٹ ڈالنے کے لئے کافی اثرات کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں آپ لوگوں کو "افغانی ہوے" سے ڈرایا جاتا ہے اور ہمیں ہندو راج سے۔ کیونکہ ان کا یہ کہنا ہے کہ ہندو زیادہ

دولت مند ہے ۔ زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور زیادہ قوم پرست اور ترقی پذیر ہے ۔ جو لوگ مجھے ہندو راج سے ڈراتے ہیں ان سے میں کہتا ہوں کہ ایک غیر کی غلامی سے اپنے پڑوسی اور اپنے بھائی کی غلامی کہیں زیادہ بہتر ہے ۔"

باب پنجم

خدائی خدمت گار

۱۹۲۴ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد خان عبدالغفار خاں نہایت خاموشی سے اصلاحی کاموں میں لگ گئے۔ اکثر کانگریس کے مختلف سالانہ جلسوں میں بھی وہ شریک ہوئے لیکن چونکہ وہ بڑی سیدھی سادی طبیعت رکھتے ہیں اور نمائش کو ذرا بھی پسند نہیں کرتے اس لئے اگر لوگوں کو ان کی طرف کوئی توجہ نہ ہوئی اور وہ زیادہ شہرت حاصل نہ کرسکے تو کیا تعجب ہے۔ البتہ وہ اپنے صوبہ میں کافی مشہور تھے۔ اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے اتمان زئی میں ایک قومی اسکول قائم کیا تھا۔ یہی وہ اسکول ہے جس سے بے شمار قومی کارکن نکلے اور ۱۹۳۲ء میں اس کا بھی وہی حشر ہوا جو گجرات ودیا پیٹ احمدآباد کا ہوا تھا۔ انہی قومی کارکنوں سے اس عظیم الشان جماعت کی ابتدا ہوئی جو بعد میں خدائی خدمت گار کے نام سے مشہور ہوئی۔ خان عبدالغفار خاں خدا کے سچے فرماں بردار بندے ہیں۔ اس لئے اپنے رضاکاروں کے لئے کوئی اور نام ان کے ذہن میں آ ہی نہ سکتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی موزوں

نام ہو بھی نہیں سکتا۔ ابتدا میں یہ جماعت صرف اصلاحی کاموں کے لئے قائم کی گئی تھی مثلاً پٹھانوں میں بے آئینی اور لوٹ مار کا انسداد کرنا۔ ان کو تعلیم دینا اور شادی بیاہ میں فضول خرچیوں کو روکنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ۱۹۲۹ء میں یہ صورت ہوئی کہ خاں صاحب نے کانگریس کے احکام کی تعمیل کے لئے اس چھوٹی سی جماعت کو سیاسی حیثیت میں تبدیل کر دیا۔ "سرخپوشوں" کا خطاب تو اس جماعت کو بدنام کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی کسی شخص پر پہلے خود جھوٹا الزام لگائے پھر خود منصف بن کر اسے سزا دے۔ ممکن ہے اردو نہ جاننے والے افسر خدائی خدمتگار کا صحیح تلفظ ادا نہ کر سکے ہوں یا ممکن ہے جس طرح وہ قومی تنظیم کی ہر کوشش میں کچھ نہ کچھ خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح اس جماعت کی سُرخ قمیصوں میں بھی انھیں کوئی خطرہ نظر آیا ہو اور وہ طنزاً انھیں سرخپوش کہنے لگے ہوں۔ بہرحال دونوں بھائیوں نے مجھے بتلایا کہ پہلے ان رضاکاروں کا شدھ سفید کھدر کا لباس تھا۔ لیکن یہ بڑی جلدی میلا ہو جاتا تھا اس لئے یہ تجویز کیا گیا کہ قمیصوں کو گیروا رنگ دیا جائے۔ اس رنگ کو سرخ کہنا بالکل غلط ہے اور نہ اسے سویٹ روس کے سرخ رنگ سے کوئی مناسبت ہو سکتی ہے۔

کانگریس کے احکام کے مطابق خدائی خدمت گار عموماً بدیشی کپڑے اور شراب کی دوکانوں پر دھرنا دیتے تھے۔ انھیں باضابطہ قواعد سکھائی جاتی تھی

اور فوجی انداز سے دور دور تک انھیں پیدل چلایا جاتا تھا۔ لیکن ہر قسم کے ہتھیاروں کی حتیٰ کہ لاٹھی تک کی قطعی ممانعت تھی۔ سخت فوجی قوانین کے ماتحت ان کی تربیت کیجاتی تھی۔ اور ذراسی نافرمانی پر انھیں برطرف کر دیا جاتا تھا۔ شامل ہوتے وقت اراکین کو حسب ذیل حلف لینا پڑتا تھا۔

کہ ہم (۱) خدا۔ ملک اور قوم کے وفادار رہیں گے۔

(۲) ہمیشہ عدم تشدد پر عمل کریں گے۔

(۳) اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ قبول نہ کریں گے۔

(۴) خوف و ہراس کو قریب نہ آنے دیں گے اور ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہیں گے

(۵) پاک صاف زندگی بسر کریں گے۔

اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں خدائی خدمت گاروں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن خاں صاحب کی گرفتاری سے تحریک میں اور ترقی ہوئی۔ اس کے بعد بے شمار لاٹھی چارج ہوئے اور گولیاں چلیں جس سے تحریک دبنے کے بجائے اور مقبول ہوتی گئی اگر میرے پاس تمام شہادتیں موجود بھی ہوں اور ان کی چھان بین کرنے کی مجھے فرصت بھی ہو تب بھی میں ان تمام واقعات کو ناظرین کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہتا کیونکہ سول نافرمانی آج کل ملتوی ہے اور اس کے

موجد کی یہ خواہش ہے کہ خواہ اس کا دوبارہ شروع کرنا ممکن بھی ہو پھر بھی فی الحال اسے روکا جائے بس اتنا کہنا کافی ہو گا کہ دونوں بھائی ان واقعات کی تائید میں بہت کچھ کہہ سکتے ہیں جن کی تفصیل اس ضبط شدہ لٹریچر میں ملے گی، جو ان کی اور انکے رضاکاروں کی صفائی میں شائع ہوا ہے۔ بڑے بھائی نے اپنی آنکھوں سے بہت سے وحشیانہ مظالم دیکھے ہیں اور مجھ سے بیان کئے ہیں لیکن میں ان دونوں کی اجازت سے ان دردناک واقعات کو نظر انداز کئے دیتا ہوں۔

بہر صورت ایک چیز نظر انداز نہیں کیجا سکتی۔ ان رضاکاروں کے خلاف سرکاری طور پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ ان کا رویہ تشدد آمیز تھا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک یعنی پورے چار سال میں سرخ پوشوں کے تشدد کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اپریل ۱۹۳۰ء کے پشاور کے حادثہ کی سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ذرائع سے تحقیقات کی گئی۔ اگرچہ پٹیل کمیٹی اور سلیمان کمیٹی دونوں کی رپورٹوں میں اس ہیبت ناک حادثہ کے بعض خون آشام واقعات کا تذکرہ ہے لیکن ان رپورٹوں میں یا سرکاری عہدیداروں کی شہادتیں کہیں بھی کسی خدائی خدمت گار یا سرخ پوش کا ذکر نہیں آیا ہے۔ حکومت نے ان کے خلاف زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا ہے وہ حسب ذیل اعلان سے

ظاہر ہوتا ہے جو صوبہ کے چیف کمشنر نے مئی ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا:-

"اپنے گاؤں میں کانگریس کے ان رضاکاروں کو مت آنے دو جو سرخ قمیص پہنے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خدائی خدمت گار کہتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ گاندھی کے چیلے ہیں۔ وہ بالشویکوں کا سا لباس پہنتے ہیں اور یہاں بھی وہ طوائف الملوکی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو بالشویکوں نے روس میں کی ہے"

یہ بتلانا دشوار ہے کہ سرخپوشوں کو بالشویک کہنے سے ان کا کیا مفہوم ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ۲۳ اپریل کے حادثے کے بعد جتنے سرکاری اعلان شائع ہوئے ان میں سے کسی ایک میں بھی سرخپوشوں کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں فادر ایلون نے اپنے مختصر قیام کے دوران میں اکثر افسروں سے ملے تھے۔ اور ان افسروں نے خدائی خدمت گاروں کے خلاف جو کچھ الزام لگائے تھے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) بعض پولیس افسروں کی توہین کی گئی اور ان سے بدکلامی کی گئی (۲) ان کی موٹروں پر پتھر اور گوبر پھینکا گیا۔ (۳) کوہاٹ میں پتھر اور اینٹیں پھینکی گئیں جس سے مشتعل ہو کر حکام نے گولی چلائی کسی ایسی تحریک میں جس کا انحصار سراسر عدم تشدد پر ہو اگر یہ حرکتیں واقعی کی گئیں تو نظر انداز کرنے کے قابل نہیں لیکن ساتھ ہی یہ چیز بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ حکومت نے تمام ذمہ دار رہنماؤں کو گرفتار کر کے اس قسم کی نازیبا حرکتوں

کے امکانات خود پیدا کر دے۔ علاوہ ازیں اس بہادر قوم کی جو ذلت اور بے عزتی کی گئی اس کے مقابلہ میں یہ جرائم کچھ بھی نہیں ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہت سے سُرخ پوشوں نے معافی نامے داخل کر کے رہائی حاصل کی۔ یہاں مجھے ان فرضی افسانوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس بحث میں پڑنے سے مجھے حکومت کی ریشہ دوانیوں پر بھی مفصل رائے زنی کرنا ہوگی۔ لیکن یہ چیز ہمارے موضوع سے باہر ہے بس اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ حکایتیں نہ تو اس جانباز قوم کے شایان شان ہیں اور نہ ان کے بہادرانہ کارناموں سے انھیں کوئی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں ہم ان دو شخصوں کا تذکرہ کر چکے ہیں جنھوں نے اپنی طرف سے ضمانت داخل کئے جانے پر اپنی جانیں دیدی تھیں حالانکہ ضمانت داخل کرنا اتنا معیوب نہیں جتنا معافی مانگنا ذلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کے بہادر صرف ضمانت داخل کرنے پر اپنے گولی مار سکتے ہوں اس کے افراد معافی مانگنا کب گوارا کریں گے۔

ان بہادر پٹھانوں نے جیل کے اندر اور جیل کے باہر جو طرح طرح کے مصائب برداشت کئے۔ منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کے سلسلہ میں جو نقصانات اٹھائے اور انتہائی اشتعال کے باوجود جس حیرت انگیز قوت برداشت

کا ثبوت دیا۔ آج ان سب پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے ممکن ہے کسی وقت
پورے اور صحیح حالات منظرِ عام پر آئیں۔ اس وقت دنیا دیکھے گی اور تسلیم
کرے گی کہ یہ وہ کارنامے ہیں جن پر کوئی قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

باب ششم

الزام اور اس کی حقیقت

اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ آخر خان برادران کا جرم کیا تھا؟ تمام سرکاری
بیانوں میں بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لئے
بظاہر ان کا یہی جرم معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس شخص کے بڑے بھائی ہیں جو حکومت
کے نزدیک بہت بدنام ہے۔ اور چھوٹے بھائی کے خلاف الزام یہ ہیں کہ:

(۱) جب مہاتما جی گول میز کانفرنس کے لئے روانہ ہو گئے تو انھوں نے
کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ہدایت کے مطابق صوبہ کے طول و عرض میں دورہ کیا۔

(۲) انھوں نے امتناعی احکامات کی خلاف ورزی کی اور دیہات کا
دورہ کیا۔ اور مذہبی وعظ کے بہانے سے مسجدوں میں سیاسی تقریریں کیں۔

(۳) انھوں نے مالگذاری اور آبیاشی ادا نہ کرنے کی تلقین کی اور لوگوں
کو ترغیب دی کہ سرکاری نہروں کا پانی نہ لیں۔

(۴) سرخ پوش ایک انقلابی جماعت تھی۔ اور اس کا مقصد یہ تھا
کہ برطانیہ کو ہندوستان سے بزور شمشیر نکال دیا جائے۔ خاں صاحب انہی
لوگوں کے ذریعہ سے قبائلی علاقہ میں اپنے اصولوں کی نشر و اشاعت کیا کرتے تھے۔

(۵) پشاور میں کانگریس کی تحریک سے ہندوں کے علاقہ پر بھی اثر پڑا۔

(۶) صوبہ کانگریس کمیٹی نے وزیر اعظم کے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کے اعلان کو ٹھکرادیا اور مکمل آزادی کے مطالبہ کا اعادہ کیا۔ علاوہ ازیں دونوں بھائیوں نے چیف کمشنر کے دربار میں شرکت کی دعوت قبول نہیں کی۔

(۷) اگرچہ عدم تشدد پر عمل کرنے پر زور دیا جاتا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کوئی زبردست واقعہ رونما ہونے والا ہے جس کے لئے ابھی سے متحد ہو جانا چاہئے اور آزادی کی اس جدوجہد کو ازسرنو جاری کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے جسے وہ جنگ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔

(۸) گاندھی اردن معاہدہ کو خاں صاحب ہمیشہ عارضی کہا کرتے تھے۔

(۹) میرٹھ کی ایک کانفرنس میں خاں صاحب نے کہا تھا کہ وہ کانگریس میں صرف اس لئے شریک ہوئے کہ ان کا اور کانگریس دونوں کا ایک ہی مقصد ہے یعنی "برطانیہ کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا"

(۱۰) خدائی خدمت گاروں نے مقدمات میں صلح نامے کرائے۔ ان کے خود فیصلے کئے اور گواہوں کو عدالت میں حاضر ہونے سے روکا۔ اس طرح گویا انھوں نے نفاذ قانون میں دخل دیا۔

پہلا۔ چھٹا۔ آٹھواں اور نواں الزام خاں صاحب کو بلا تامل تسلیم

ہوگا کیونکہ یہ کوئی ایسے جرم نہیں ہیں جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہوں۔ بہت سے رہنما انہی جرائم کے مرتکب ہوئے لیکن آج ان کے خلاف کوئی حکم امتناعی نافذ نہیں ہے۔ البتہ ایک حد تک یہ صحیح ہے کہ انھوں نے کبھی کبھی لگان وغیرہ ادا نہ کرنے کی تلقین کی۔ لیکن ان کا یہ فعل عدم ادائی لگان کی تحریک کے سلسلہ میں نہ تھا انھوں نے تو اپنی جائداد کا لگان خود داخل کیا تھا۔ ہاں صرف ان لوگوں کو یہ تلقین کی جو غربت کے سبب ادائگی سے قاصر تھے۔

دوسرا۔ چوتھا اور پانچواں الزام بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگر حکومت کو ان کی صحت کا یقین تھا تو اس نے خاں صاحب پر مقدمہ چلایا ہوتا۔ خاں صاحب اس کی پرزور تردید کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی تشدد کی حمایت یا تلقین نہیں کی۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ تحریک ہرگز پرامن نہ رہتی اور آسانی سے جارحانہ صورت اختیار کر جاتی۔ حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔

آخری الزام سرخپوشوں کے لئے بدنامی کا باعث نہیں بلکہ موجب فخر ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تحریک کتنی منظم تھی اور سرخپوشوں نے عدالتوں سے عدم تعاون کے اصول کو کتنے مکمل طریقہ سے عملی جامہ پہنایا۔ دوسرے صوبوں میں بھی اس پر عمل کیا گیا لیکن کہیں اتنی معقول کامیابی نہ ہوئی۔

نویں الزام پر ذرا تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب مہاتما

جی کی تجویز کے مطابق ہوم سکرٹری نے خان عبدالغفار خاں سے ملاقات کی تھی تو میرٹھ کی یہ تقریر بھی مثال کے طور پر پیش کی تھی۔ اس تقریر کے سرکاری ترجمے سے خراب سے خراب چند اقتباس ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

"اگر میرے دم میں دم ہے تو میں انگریزوں کو اپنے وطن پر حکومت نہ کرنے دوں گا اور خدا کی ذات سے امید ہے کہ بالآخر میں کامیاب ہوں گا۔"

"لوگوں کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں نے کانگریس میں شریک ہو کر ملت فروشی کی ہے۔ برطانوی قوم کانگریس اور پٹھان دونوں کی دشمن ہے اور کانگریس برطانیہ کے خلاف جدوجہد کر رہی ہے اس لئے میں کانگریس میں شریک ہو گیا ہوں اور برطانیہ سے چھٹکارا پانے کے لئے اس کے ساتھ اشتراک عمل کر لیا ہے۔ ہمیں فرنگیوں کے دھوکے میں ہرگز نہ آنا چاہئے۔"

"ہمارے (یعنی کانگریس اور سرخ پوشوں کے) دو مقاصد ہیں اول یہ کہ اپنے ملک کو آزاد کریں۔ دوسرے یہ کہ بھوکوں کا پیٹ بھریں اور ننگوں کو کپڑا مہیا کریں۔"

"جب تک آزادی حاصل نہ ہو جائے ہرگز چین نہ لو۔ چاہے توپوں اور بم کے گولوں سے بھی تمھیں اڑا دیا جائے لیکن قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔ اگر بہادر ہو تو میدان جنگ میں نکل کھڑے ہو اور انگریزوں سے مقابلہ کرو جو

ہماری ساری مصیبتوں کی جڑ ہیں۔ کانگریس انگریزوں کی مخالف ہے۔ اور انگریز کانگریس اور پٹھان دونوں کے دشمن ہیں۔ اسی لئے میں بھی کانگریس میں شریک ہوا ہوں"

مذکورہ بالا اقتباسات میرٹھ اور سرحد کی تقریروں کے ہیں ذرا ان کا مقابلہ بار دولی کی تقریروں کے اُن اقتباسات سے کیجئے جو پچھلے کسی باب میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ کیا یہ وہی بہادر۔ سچا اور پرخلوص شخص نہیں ہے جو دونوں موقعوں پر یکساں اپنا مسلک پیش کر رہا ہے اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان اقتباسات میں وہ خونخوار معلوم ہونے کے بجائے زیادہ تر بھدّا اور بھونڈا ترجمہ کرنے والوں کا شکار معلوم ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ جنگی اصطلاحات میں گفتگو کرتے ہیں لیکن اس زمانہ میں کون ایسا نہ کرتا تھا اور آج بھی کون نہیں کرتا ؟ مگر یہ جنگ برطانیہ کو بزور شمشیر نکالنے کی جنگ نہیں بلکہ خود توپوں اور بم کے گولوں کا نشانہ بننے کی جنگ ہے۔ سرکاری مترجم بھی ان کے اس بیان سے انکار نہیں کر سکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ معاہدہ جسے دو دردمند ہستیاں انتہائی کوشش کے بعد وجود میں لائی تھیں، سرکاری افسروں کی نظر میں عموماً اور سرحد کے ارباب حکومت کی نظر میں خصوصاً بہت زیادہ کھٹکتا تھا۔ انھیں اس سے

نہ پہلے کوئی مطلب تھا نہ اب ہے کہ سرخ پوش تشدد پر عمل پیرا کیوں ہیں یا خان صاحب اس کی تلقین کیوں کرتے ہیں بلکہ انھیں تو یہ چیز گراں گذرتی تھی کہ انتہائی مظالم کے باوجود یہ لوگ مشتعل کیوں نہیں ہوتے " گاندھی کے خادم " کیوں بن گئے ہیں ۔ اور " سرحدی گاندھی " کے احکام کی تعمیل اس طرح بے چون وچرا کیوں کرتے ہیں ۔

باب ہفتم

انگریزوں سے چند باتیں

پچھلے باب میں ہم نے جو الزامات درج کئے ہیں وہ تو تین برس پرانے ہوچکے۔ اب ذرا چند نئے اتہام ملاحظہ ہوں۔ ان بے بنیاد الزاموں کی پاداش میں گویا تین برس کی قید کافی نہ تھی۔ اس لئے خاں صاحب کے ایک نئے عیب جو سر مائیکل اڈوائر نے اخبار مارننگ پوسٹ میں ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے خاں صاحب کے خلاف چند نئے الزام تراشے اور حکومت ہند پر سخت اعتراض کیا کہ اس نے ایسے باغیوں کو یہ محدود آزادی بھی کیوں دی۔ ان سابق گورنر صاحب نے اپنی ابتدائی عمر صوبہ سرحد میں گذاری اس لئے ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس صوبہ اور اس کے لیڈر کو شاید حکومتِ وقت سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ انھوں نے ان دونوں بھائیوں پر دہشت انگیزی اور کمیونزم کا الزام عائد کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ چھوٹے بھائی کے متعلق لکھتے ہیں: "خان عبد الغفور (؟) خاں وہ جری انقلاب پسند ہے جو سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہے۔ حالانکہ گاندھی کے عدم

تشدد کے ڈھونگ کا وہ کھلم کھلا مضحکہ اڑاتا ہے اور صاف صاف اعلان کرتا ہے
کہ اس کا مقصد برطانیہ کو نکال باہر کرنا اور صوبہ سرحد میں سویٹ اصولوں پر
ایک جمہوریت قائم کرنا ہے " یہ گویا حکومت کے ابتدائی الزامات کا نقش
ثانی ہے لیکن اس زہر آلود نقش ثانی کے مقابلہ میں جو سر ہائیکل کی شوخی تحریر
کا مرہون منت ہی نقش اول بالکل ماند پڑگیا ہے۔ اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ اس
ناپاک الزام کی عمارت کن بنیادوں پر قائم ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ
" مخالف سرحدی قبائل سے عبدالغفور کا بہت ساز باز ہے اور وہ ہمارے
مستقل دشمن حاجی ترنگ زئی کے داماد ہیں۔ یہ وہی حاجی ترنگ زی ہیں
جنھوں نے گذشتہ چند سال میں ہمند۔ افریدی اور دیگر قبائل کو بارہا پشاور پر
حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے "

اس سلسلہ میں چند واقعات ملاحظہ کیجئے۔ سب سے پہلے میں یہ کہدوں
کہ خاں صاحب اور حاجی ترنگ زئی میں اتنا ہی تعلق ہے جتنا خاں صاحب اور
ان کے رسوا کرنے والے سر ہائیکل اڈوائر میں ہے۔ خاں صاحب کے خسر
رجڑ کے سلطان محمد خاں تھے جو اپنی آخری عمر تک J. P. (جسٹس آف
دی پیس) رہے اور شاید خاں صاحب سے زیادہ سرکاری افسروں کو ان
کی خدمات کا علم ہوگا۔ سر ہائیکل نے حاجی ترنگ زئی کو خاں صاحب کے

خسر کے ساتھ کیسے مخلوط کر دیا؟ اس کی تشریح غالباً یہ ہے کہ حاجی صاحب موضع
ترنگ زئی کے رہنے والے ہیں جو خاں صاحب کے موضع اُتمان زئی سے
بہت ہی قریب ہے۔ آپ اس وقت منظر عام پر آئے جب اپنی اصلاحی تحریک
کے سلسلہ میں آپ نے بہت سے مدارس قائم کئے۔ اس لئے صوبہ سرحد
میں قومی تعلیم کا اگر انھیں پیشرو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ خان عبد الغفار خاں
بھی ان کی اس تعلیمی تحریک میں بخوشی شریک ہو گئے۔ غالباً یہی وہ زمانہ ہوگا
جب سر ائیکل وہاں کوئی معمولی افسر ہوں گے۔ بعد میں حاجی صاحب حکومت
کے نزدیک بہت بدنام ہو گئے اس لئے سر ائکل نے حاجی صاحب اور خاں
صاحب کے ان قدیم تعلقات کے علم سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور چونکہ ان کے
نزدیک حسن بیان پر حق گوئی کو قربان کر دینا کوئی گناہ نہیں ہے اس لئے انھوں
نے حاجی صاحب کو خاں صاحب کا خسر بنا دیا۔ حاجی صاحب کے حالات
بیان کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں ہے لیکن اتنا بتلا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے
کہ حاجی صاحب کے تمام مدارس ۱۹۱۵ء میں بند کر دئے گئے۔ وہ اپنے
موضع سے فرار ہو گئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔ اس کے بعد ان کے متعلق
جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف
افغانستان کی مدد کی تھی اور ۱۹۲۱ء میں جب خان عبد الغفار خاں مہاجرین

کو افغانستان لے کر گئے تھے اور پھر وہاں سے واپس آئے تو راستہ میں حاجی صاحب بھی اُن سے ملے تھے۔ لیکن اس کے بعد نہ وہ کبھی ان سے ملے اور نہ ان کے متعلق کوئی علم ہوا۔

یہاں تک حاجی صاحب کا معاملہ ہوا۔ اب قبائل سے سازباز کے مسئلہ کو لیجئے۔ قبائلی علاقہ کے متعلق پہلے چند واقعات پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سرحد کے پانچ برطانوی اضلاع کے آگے یہ پہاڑی علاقہ ہے جو بلوچستان اور ہندوکش تک پھیلا ہوا ہے اسے ”آزاد علاقہ“ کہتے ہیں۔ اس کا رقبہ برطانوی اضلاع سے تقریباً دوگنا ہے اور آبادی ان کے برابر ہی ہے۔ سب پٹھان تھوڑے بہت فرق کے ساتھ پشتو ہی بولتے ہیں۔ اس علاقہ کی نام نہاد آزادی دراصل ایک دھوکہ ہے۔ برطانوی اضلاع کا گورنر اس علاقہ پر بھی گورنر جنرل کے ایجنٹ کی حیثیت سے حکمرانی کرتا ہے اور قبائل صوبہ سرحد کی فوجی بساط پر شطرنج کے مہروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ وہ نہایت وحشی اور غیر تربیت یافتہ ہیں پھر بھی اتنے بے حس نہیں ہیں کہ انھیں قرب وجوار کی عام بیداری کا احساس نہ ہو۔ یہ چیز تو انھیں ایک معجزہ معلوم ہوتی ہو گی کہ ایک پٹھان لاٹھی کے وار اور طرح طرح کی تذلیل مسکراتے ہوئے برداشت کر جائے اور غصہ میں آپے سے باہر نہ ہو۔ یہ حیرت انگیز تجربہ ان میں ایک

اشتیاق پیدا کرنے کے لئے بہت کافی تھا۔ چنانچہ قرب وجوار میں اس تحریک سے اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ وہ لوگ خود اس میں شریک ہونے لگے۔ علاوہ ازیں کون سے تعجب کی بات ہے اگر ایک ہی قوم اور ایک ہی خیال کے لوگ اپنے کاندھوں پر سے دوہرا جوا اتار پھینکنے کی غرض سے متحد ہو گئے یعنی ایک تو قبائلی سردار کا جوا اور دوسرے برطانیہ کا جو انہیں اپنا زرخرید غلام سمجھتی ہے یہ تصور کرنا انتہائی حماقت ہوگی کہ اس زمانہ میں کسی جماعت کی لاعلمی اور جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے عرصہ تک دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ خاں صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ مالکنڈ۔ باجوڑ اور سوات کے قریبی علاقوں سے یہ لوگ میرے قائم کردہ آزاد اسکول میں اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے بھیجا کرتے تھے اور ایک حد تک ان قبائل نے بھی اپنے برطانوی اضلاع کے بھائیوں کے ساتھ اپنی قسمتیں وابستہ کر دی تھیں۔ ان میں سے بعض لوگ خدائی خدمت گار بھی بنے اور جیل بھی گئے لیکن مذکورہ بالا علاقوں کے علاوہ دور کے قبایل پر کوئی اثر نہ پڑا۔ خان عبدالغفار خاں اپنی خواہش کو چھپاتے نہیں ہیں کہ کاش سارے قبائل امن پسند ہو جائیں اور سارا سرحدی علاقہ پوری طرح مشترک اور متحد ہو جائے۔ لیکن یہ تو محض ایک خواب ہے اور کون جانتا ہے کہ یہ کبھی پورا بھی ہوگا۔

خاں صاحب کو کبھی سرحد کے پار قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی۔ یہانتک کہ ۱۹۳۱ء میں جب شریمتی دیوداس جی گاندھی سرحد گئے اور انھوں نے چکدھرہ کاپل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو خاں صاحب اپنے مہمان کی یہ معمولی سی تواضع بھی نہ کرسکے۔ یہ پل اس سڑک کے آگے واقع ہے جو مالاکنڈ ایجنسی میں سے گذرتی ہے اور یہاں کے دلکش مناظر دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ حالانکہ شریمتی دیوداس جی گاندھی نے افسران متعلقہ سے صاف صاف کہدیا تھا کہ وہ اور خاں صاحب دونوں محض تفریح کی غرض سے وہاں جانا چاہتے ہیں لیکن پہلے سے چونکہ کوئی انتظام نہ کیا گیا تھا اس لئے اجازت نہ مل سکی۔

سرحدی قبائل کے متعلق ہمیں یہ علم ہے کہ وہ اکثر برطانوی اضلاع میں لوٹ مار کیا کرتے ہیں لیکن سر مائیکل اڈوائر کو معلوم ہونا چاہئے کہ خاں صاحب عدم تشدد کے اتنے معتقد اور مہاتما جی کے اتنے فرمانبردار ہیں کہ ایک مرتبہ انھوں نے گاندھی جی سے دریافت کیا تھا کہ اگر ڈاکو یا لٹیرے حملہ کریں تو خدائی خدمت گار کو اپنی مدافعت میں تشدد سے کام لینا چاہئے یا نہیں۔

سر مائیکل نے خاں صاحب پر کتنا زبردست اتہام لگایا ہے کہ "وہ مہاتما جی کے عدم تشدد کے ڈھونگ کا کھلم کھلا مضحکہ اڑاتے ہیں" خاں صاحب کے ۱۹۳۱ء کے بیان سے اس کی پوری پوری تردید ہوتی ہے۔ انھیں اس

سے انکار نہیں کہ ان کا صوبہ جیسا کہ حال ہی میں ایک سرکاری رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں زیادہ "خونی" ہے لیکن وہ دنیا کے سامنے یہ بھی تو اعلان کرتے ہیں کہ انھوں نے صوبہ سرحد کو قتل و غارت سے نجات دلانے کے لئے عدم تشدد کو اپنا مسلک بنایا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس جنوں زدہ صوبہ میں عدم تشدد سے بہتر بدامنی کا اور کوئی علاج نہیں ہو سکتا اور خان صاحب نے اس وقت سے جبکہ ہندوستان میں ستیاگرہ اتنی معروف بھی نہ ہوئی تھی اس اکسیر اعظم کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

اس سلسلہ میں ۱۹۳۱ء میں خان صاحب نے جو الفاظ کہے تھے اور جو ینگ انڈیا مورخہ ۱۱ جون ۱۹۳۱ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں پڑھ کر خان صاحب کی صداقت اور خلوص سے کوئی نیک نیت شخص انکار نہیں کر سکتا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ

"عدم تشدد قریب قریب میرا مذہب بن گیا ہے۔ میں گاندھی جی کی اہنسا کا پہلے سے بھی قائل تھا مگر اس تجربہ کو جو بے نظیر کامیابی میرے صوبہ میں حاصل ہوئی اس کے بعد تو میں دل و جان سے عدم تشدد کا حامی بن گیا ہوں۔ انشاء اللہ میرے صوبہ کے لوگ کبھی تشدد سے کام نہ لیں گے۔ اس کا مزہ ہم انتقام قتل کے جھگڑوں میں جو ہمارے خاندانوں میں چلے آرہے

ہیں اور جنھوں نے ہمیں دنیا میں بدنام کر دیا ہے خوب چکھ چکے ہیں۔ تشدد ہماری سرشت میں داخل ہے۔ اگر ہم عدم تشدد کی عادت ڈال لیں تو اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ پٹھان پر دو ہی چیزوں کا اثر ہوتا ہے یا تو معقول بات کا یا محبت کا۔ اگر آپ اس کے دل کو مٹھی میں لے لیں تو وہ جہنم میں جانے کو تیار ہو جائے گا لیکن زبردستی تو وہ جنت میں بھی نہیں جائے گا۔ محبت کا جادو اس پر خوب چلتا ہے۔ میں پٹھانوں سے یہ کہتا ہوں کہ تم دوسروں سے وہی برتاؤ کرو جو تم ان سے چاہتے ہو۔ ممکن ہے میں ناکامیاب رہوں اور میرے صوبہ میں تشدد کا طوفان برپا ہو جائے۔ ایسا ہوا تو میں اپنی قسمت کو صبر کر کے بیٹھ رہوں گا مگر اس سے میرے اس عقیدے میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی کہ عدم تشدد اچھی چیز ہے اور میری قوم کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔"

اب میں خان برادران کے خاندان کے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ انگریزوں کو ان کے مخالفانہ جذبات اور سرگرمیوں سے جو توہمات پیدا ہو گئے ہوں وہ رفع ہو جائیں۔ میں ان کے خاندان کے خاص خاص افراد کو ناظرین کے سامنے پیش کروں گا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ بڑے بھائی کی بیوی انگریز ہیں لیکن یہ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ خاں صاحب کی گرفتاری

سے قبل جب وہ ہندوستان میں تھیں تو ان کے مکان[1] کے دروازے ہر طرح کے احباب کے لئے کھلے رہتے تھے۔ ان احباب میں بے شمار سرکاری افسر بھی تھے۔ موجودہ گورنر کرنل سر رالف گرفتھ کی بیوی ان کی بہت گہری دوست تھیں۔ اور کرنل موصوف بھی بارہا ڈاکٹر صاحب کے یہاں مہمان ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر خاں صاحب کے ایک لڑکے نے ابھی لندن یونیورسٹی سے میٹرکولیشن پاس کیا ہے اور آکسفورڈ میں مزید تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ ہے۔ ان کی لڑکی اور خان عبدالغفار خاں کی لڑکی (جو اب تک مسز خاں کی سرپرستی میں تھیں) دونوں انگلستان کے ایک اسکول میں تعلیم پاتی تھیں۔ ڈاکٹر خان کی پہلی بیوی کے سب سے بڑے لڑکے سعداللہ خاں نے لاوبرو انجینئرنگ کالج میں تعلیم پائی اور وہیں سے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ سنہ ۱۹۳۰ء میں انگلستان سے واپس آئے دوسرے لڑکے عبیداللہ خاں نے جو ۷۰ روز کی بھوک ہڑتال کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئے ہیں مدراس کالج میں دباغی سیکھی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے انھوں نے انگلستان جانے کا پاسپورٹ حاصل کیا ہی تھا کہ عدم ادائی لگان کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے۔ خان عبدالغفار خاں کے

(۱) اس مکان پر اب حکومت نے تھوڑا سا معاوضہ دے کر قبضہ کر لیا ہے۔



عبدالغنی اپنے امریکن پروفیسر کے ساتھ

سب سے بڑے لڑکے نے دو سال انگلستان میں اور کئی سال امریکہ میں شکرسازی سیکھی تاکہ اپنی آبائی جائداد کے سلسلہ میں کارآمد ثابت ہوسکیں۔ (افسوس کہ یہ جائداد آرڈی ننس کے دور میں بالکل تباہ ہوگئی۔) ابھی کچھ عرصہ قبل تک یہ ملک الشعرا رابندر ناتھ ٹیگور کے شانتی نکیتن میں تعلیم پارہے تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے دہرہ دون میں کرنل براؤن کے اسکول میں پڑھتے تھے اور وہیں سے انھوں نے سنیئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ ان کا سب سے چھوٹا لڑکا اب تک اسی اسکول میں تھا لیکن اب واردھا آگیا ہے۔

پچھلے کسی باب میں ریورنڈ وگرم کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ دونوں بھائی ان شریف پادری صاحب کے شاگرد تھے اور اب بھی اکثر ان کو یاد کیا کرتے ہیں۔ بڑے ہوکر بھی انھوں نے وگرم خاندان سے مراسم قائم رکھے رفتہ رفتہ یہ تعلقات گہری دوستی کی صورت اختیار کرگئے۔ ڈاکٹر خاں صاحب اب تک ان کے بہت ممنون ہیں۔ انھیں دلی اعتراف ہے کہ ریورنڈ وگرم کے بھائی ڈاکٹر وگرم ہی کی بدولت جو آج کل ونگسٹن کالج کے پرنسپل ہیں سینٹ تھامس اسپتال لندن میں ان کا داخلہ ہوسکا تھا۔ ڈاکٹر خاں صاحب انڈین میڈیکل سروس کے ایک رکن تھے۔ اس کے اراکین میں آپ کے بے شمار احباب تھے۔ آج بھی انگریز احباب سے ان دونوں

بھائیوں کے دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ لوگ محبت آمیز خطوط ان کو لکھا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خاں صاحب پشاور کلب کے بھی رکن ہیں۔ عموماً صرف فوجی افسر اس کے رکن ہوتے ہیں۔ آپ صوبہ کے سکاؤٹس کمشنر بھی ہیں۔ اسیری کے زمانے میں ان دونوں جگہوں سے آپ کا نام خارج کر دیا گیا ہو تو مجھے علم نہیں ورنہ گرفتار ہونے تک تو وہ کلب کے ممبر بھی تھے اور سکاؤٹس کمشنر بھی۔ گرفتاری سے پہلے بڑے سے بڑے سرکاری افسروں سے ڈاکٹر خاں صاحب کے جتنے تعلقات تھے وہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک صاحب مسٹر رابرٹ براؤن صوبہ کے محکمہ زراعت میں کسی بڑے عہدے پر ممتاز تھے۔ دوران ملازمت میں وہ تمام صوبہ کا دورہ کیا کرتے تھے اسی سلسلہ میں ڈاکٹر خاں صاحب سے ان کے تعلقات ہوگئے اب وہ اپنی خدمات سے سبکدوش ہو چکے ہیں اور آسٹریلیا چلے گئے ہیں جہاں ان کی سسرال ہے۔ ڈاکٹر خاں صاحب کو ان کی اسیری کے زمانے میں وہیں سے انھوں نے ایک خط لکھا تھا جس میں دوستی اور باہمی خاطر مدارات کے خوشگوار زمانہ کو بڑے محبت بھرے الفاظ میں یاد کیا تھا۔ اسی خط میں انھوں نے خان عبدالغفار خان کے متعلق لکھا تھا کہ "آج تک مجھے خان عبدالغفار خاں کے سے شریف اور نیکدل شخص سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا"۔ میں یہ شخصی تفصیلات اس لئے لکھ رہا ہوں

کہ ناظرین اندازہ کرسکیں آیا "افغانی انقلاب پسندوں" اور "سویٹ جمہوریت کے بانیوں" سے یہ توقع کیجا سکتی ہے کہ وہ انگریزوں سے ایسے ہی بے تکلف تعلقات رکھیں گے اور اسی طرح اپنے بچوں کو برطانی فضا میں تعلیم کی غرض سے بھیجیں گے جیسے دونوں بھائیوں نے کیا ہے۔ ناظرین کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ پنجابی مسلم اخبارات کے ایک متعصب طبقہ نے نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کے جرم میں خان برادران کو مطعون کیا بلکہ اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے انگلستان اور امریکہ بھیجنے کی وجہ سے انھیں دائرہ اسلام سے بھی خارج کر دیا۔

جہاں تک سویٹ جمہوریت قائم کرنے کے الزام کا تعلق ہے ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ حکومت نے خان عبدالغفار خاں کی تقریروں کے جو اقتباسات شائع کئے ان میں بھی سویٹ نظام یا روس وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ سارے ہندوستان میں یا صوبہ سرحد میں وہ بالشویزم کبھی گوارا نہیں کرسکتے۔ سویٹ حکومت سے واقعی وہ اتنے ہی خوفزدہ ہیں جتنے برٹش راج سے۔ ان کی دلی آرزو تو یہی ہے کہ اپنے صوبہ کی دیہی جماعتوں کی از سر تو تنظیم کریں اور بغیر کسی شور و شر کے اس کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ چنانچہ ایک دن خاں صاحب نے مجھ سے کہا کہ "ہماری طرف بہت سے کپڑا بننے والے ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ سب ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ میں بڑا شکر ادا کروں گا

اگر میں چرخہ کا پیغام اپنے صوبہ کے کونے کونے میں پہنچا سکوں۔" صوبہ سرحد کے پانچ اضلاع میں تقریباً تین ہزار گاؤں ہیں اور شاید ہی کوئی گاؤں ایسا ہو جہاں خاں صاحب نہ گئے ہوں۔" لیکن چرخہ کی تلقین کرنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے اگر مجھے خود چرخہ کاتنا نہیں آتا۔ اور میں باضابطہ روزانہ نہیں کاتتا" یہ کہہ کر وہ کاتنا سیکھنے بیٹھ گئے اور تین چار دن کے اندر ہی نہایت عمدہ یکساں اور اچھا بٹا ہوا سوت کاتنے لگے۔

جب کبھی اشتراکیت کے مسئلہ پر ان سے کوئی بحث کرتا ہے تو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ "گاندھی جی سے بہتر کوئی اشتراکی ہمیں بتا دو۔ ہم اس کے پیچھے چلنے کو تیار ہیں۔" اکثر وہ اس زمانے کا تذکرہ کیا کرتے ہیں جب ان کے صوبہ میں زیر کاشت زمین وقتاً فوقتاً از سرِ نو تقسیم کی جاتی تھی لیکن اس ازسرِ نو تقسیم کا مفہوم میری سمجھ میں نہ آیا تھا۔ ایک مرتبہ اسے سمجھاتے ہوئے خان عبدالغفار خاں نے فرمایا کہ "یہ خان کا درجہ جو زمینداری کا مترادف ہے برطانیہ کی ایجاد ہے۔ زمینداریاں تو اس لئے قائم کی گئیں کہ جدید نظام حکومت کو امداد ملے۔ ۱۸۴۹ء میں برطانوی حکومت کے قیام کے کوئی ۲۵ برس بعد خود میرے دادا کو سینکڑوں ایکڑ زمین دے کر خان بنایا گیا تھا لیکن اس کے باوجود میں یہ اعتراض کر رہا ہوں۔ پرانے زمانے میں سرداروں کا ایک جرگہ سب دیہاتوں

کے اور دیہاتوں کی سب زمینوں کے نمبر مقرر کرتا تھا ۔ اس کے بعد قرعہ کے
ذریعہ سے یہ زمین تقسیم کر دیتا تھا ۔ ہر بیس سال بعد پھر یہی صورت ہوتی تھی ۔ ہر
شخص کو حتیٰ کہ سرداروں کو بھی برابر برابر زمین دیجاتی تھی اور اس نئی تقسیم کے
ماتحت ساری آبادی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو منتقل ہو جاتی تھی ۔
میرے نزدیک تو اس سے بہتر اور کوئی سوشلزم ہو نہیں سکتا ''

باب ہشتم

سارا خاندان جیل میں

ان بھائیوں کی آخری غیر متعین نظر بندی سے پہلے کے واقعات مختصراً میں
یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں خواہ ہم اس مسئلہ کو صرف صوبہ سرحد ہی تک محدود رکھیں
پھر بھی اس کی تفصیلات پر بحث کرنا سخت مشکل ہے کہ گاندھی ارون معاہدہ کی
خلاف ورزی کا کون ذمہ دار ہے علاوہ ازیں اس کی صحیح تفصیلات بھی مہیا
نہیں ہو سکتیں لیکن ہمیں یہ افسوس ہوتا ہے کہ اس معاہدہ کے دوران میں لگان
داخل نہ ہونے پر خدائی خدمت گاروں کو خصوصیت سے تختہ مشق بنایا گیا ۔
حالانکہ اس وقت عدم ادائی لگان کی کوئی تحریک بھی نہ تھی اور خان برادران نے
خود بھی اپنی جائداد کی مالگذاری ادا کر دی تھی چونکہ اس کتاب کا یہ مقصد نہیں ہے
کہ گڑے مردے اکھیڑے جائیں یا حکومت کے خلاف الزام تراشے جائیں ۔
اس لئے میں ظلم و تشدد کے بے شمار مکروہ واقعات کو نظر انداز کرتا ہوں ، لیکن
دو مثالیں بہر حال پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو سختی کے لحاظ سے نسبتاً کم درجہ
کی ہیں ۔ ایک مثال تو اس لئے پیش کرتا ہوں کہ وہ خان صاحب کے خاندان

کے ایک فرد سے متعلق ہے اور دوسری اس لئے کہ اس کی تفصیلات کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

معز اللہ خاں کا واقعہ کافی مشہور ہے۔ وہ بہت بڑے زمیندار اور خدائی خدمت گار تھے۔ مالگذاری ادا نہونے کی وجہ سے انھیں حوالات میں بند کر دیا گیا اس پر انھوں نے افسران کو ایک خط لکھا کہ مجھے سرکاری مطالبہ ادا کرنے سے انکار نہیں ہے اور جلد از جلد میں ساری رقم ادا کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور دو ہزار بقایا کی خاطر ان کی ایک موٹر۔ ایک تانگہ۔ ایک گھوڑا اور تین بھینسیں قرق کی گئیں۔ رہائی کے بعد پھر ان کی تیار فصلیں بھی قرق کر لیں لیکن اس پر بھی صبر نہ آیا اور بالآخر ان کی ڈیڑھ لاکھ کی پوری جائداد ضبط کر لی۔

ڈاکٹر خاں صاحب کے دوسرے صاحبزادے عبید اللہ خاں پر جن کا تذکرہ پچھلے باب میں آچکا ہے مالگذاری کا بہت کافی روپیہ باقی تھا۔ انھوں نے بیشتر حصہ تو ادا کر دیا۔ صرف تین سو روپئے باقی رہ گئے۔ اس جرم میں انھیں گرفتار کرکے چارسدہ کی جیل میں بند کر دیا گیا۔ یہ جیل اتنی زیادہ گندی تھی کہ انھوں نے ایسی غلیظ جگہہ پر کھانا کھانے سے قطعی انکار کر دیا۔ انھیں ڈیڑھ ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ لیکن ۲۰ دن تک انھیں بھوک ہڑتال کرنا پڑی جب کہیں جاکر حالات میں کچھ اصلاح ہوئی اور اس کے دو چار دن بعد ہی وہ رہا ہوگئے اور افاقہ کی

غرض سے ایک ماہ تک اپنے والد کی نگرانی میں رہے۔ پھر اپنے موضع پر چلے گئے اور آرڈی ننس کے ماتحت وہاں دوبارہ گرفتار کرلئے گئے۔

جس سرکاری اعلان کی رو سے آرڈی ننس نافذ ہوا اس میں خان برادران پر بہت سے الزامات عائد کئے گئے تھے۔ لیکن ان قصوروں نے اتنی ہیبت ناک صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اگر انھوں نے یہ دعوت نامہ منظور نہ کیا تو کون سے تعجب کی بات ہے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی جماعت کی طرح طرح ذلت کی جارہی ہے۔ ان کے اس انکار سے حکومت کو آرڈی ننس نافذ کرنے کا اور دونوں بھائیوں کو مع خاص خاص افراد خاندان گرفتار کرلینے کا بہانہ مل گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ دربار میں شریک ہوجاتے تو کیا آرڈی ننس نافذ نہ ہوتا؟ چھوٹے بھائی مہاتما جی سے ملنے کے لئے بمبئی جانے کی تیاری کر رہے تھے کیونکہ وہ ۲۹ر دسمبر کو لندن سے واپس آنے والے تھے اور بڑے بھائی کو پنڈت جواہر لال نہرو نے جن سے لندن کی طالب علمی کے زمانے کے ان کے گہرے تعلقات تھے بڑے دن کی تعطیل الہ آباد میں گذارنے کے لئے مدعو کیا تھا اس لئے وہ وہاں جانے والے تھے لیکن حکومت نے ان کے لئے ایک دوسرے ہی قسم کے بڑے دن کا انتظام کیا تھا چنانچہ ان دونوں بھائیوں کو ۲۴ر کی شب



جیون لال صاحب کنجو، ڈاکٹر [illegible] صاحب اور [illegible] لال

(یہ تصویر ۱۹۱۰ء میں [illegible])

میں گرفتار کرکے اٹک برج بھیجدیا گیا۔ ڈاکٹر خاں صاحب کے بڑے صاحبزادے سعداللہ خاں حال ہی میں انگلستان سے واپس آئے تھے اور صوبہ کانگریس کمیٹی کے سکرٹری مقرر ہوئے تھے۔ انھیں بھی گرفتار کرکے باپ اور چچا کے ساتھ ہی اسپیشل ٹرین میں روانہ کردیا گیا۔ مسز خان صاحب کو اپنے گاؤں گئے ابھی دو روز ہوئے تھے کہ آدھی رات کو سارے گھر کو جگایا گیا اور حکم دیا گیا کہ پولیس مکمل تلاشی لے گی اس لئے فوراً مکان خالی کردو اور باہر نکل جاؤ۔ اسی وقت ڈاکٹر صاحب کے دوسرے صاحبزادے عبیداللہ خاں کو بھی گرفتار کرلیا گیا جنھیں بھوک ہڑتال کے بعد پوری طرح صحت بھی نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ ان چاروں کو ایک ساتھ گرفتار کیا گیا لیکن حکومت انھیں ایک ہی جیل میں رکھنا کب گوارا کرسکتی تھی چنانچہ بڑے بھائی کو تو اسپیشل ٹرین سے اتار کر نینی جیل (الہ آباد) بھیجدیا گیا۔ چھوٹے بھائی کو ہزاری باغ اور بڑے لڑکے سعداللہ خاں کو بنارس جیل بھیجا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب ملک میں بہت کچھ احتجاج ہوا تب کہیں بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی کے پاس ہزاری باغ جیل میں منتقل کیا گیا اور ان کے چھوٹے بیٹے عبیداللہ خاں کو تو خاص بدسلوکیوں کے لئے منتخب کرلیا گیا جن کی تفصیلات میں آگے چل کر پیش کروں گا۔ اب مکان پر صرف ڈاکٹر صاحب کی بیویاں اور دونوں بھائیوں کے چھوٹے بچے رہ گئے تھے۔ (خان عبدالغفار خان کی بیوی کا تو کوئی دس سال

ہوئے انتقال ہو چکا ہے) اس زمانے میں سینکڑوں ہزاروں پٹھان خاتونیں سیاسی جلسوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح ان کی دونوں بہنوں نے بھی تحریک میں کافی حصہ لیا تھا لیکن انھیں گرفتار نہیں کیا گیا۔ البتہ ان کے بیٹوں اور دور نزدیک کے بھتیجوں، بھانجوں سب کو گرفتار کر لیا اور اس کے بعد ایک طرف سے تمام خاص خاص خدائی خدمت گاروں کی گرفتاری شروع ہو گئی۔

اگر خان عبدالغفار خاں کو بمبئی جانے کا موقع مل جاتا اور اگر پنڈت جواہر لال نہرو کو بمبئی کے راستے میں گرفتار نہ کر لیا جاتا تو گذشتہ تین سال کی سیاسی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ اور اگر ان دونوں اہم گرفتاریوں کے باوجود جو معاہدہ کی سراسر خلاف ورزی تھی اور جن سے حکومت کے معاندانہ رویہ کا صاف صاف اظہار ہوتا تھا مہاتما جی کو لارڈ ولنگڈن سے ملاقات کرنے کا موقع دیا جاتا تو بھی سیاسی تاریخ بدل جاتی۔ مہاتما جی کی اس سے زیادہ اور کوئی خواہش نہ تھی کہ تنسیخ معاہدہ کے مسئلہ پر گفتگو کریں اور ان کی یہ عین آرزو تھی کہ اگر ممکن ہو تو اسے از سر نو نافذ کیا جائے۔ گرفتار ہونے کے چند دن بعد ہی مہاتما جی نے جیل سے لارڈ ولنگڈن کو ایک خط لکھا تھا جس میں ان سے درخواست کی تھی کہ کم از کم ایک قیدی ہی کی حیثیت سے مجھے ملنے کی اجازت دی جائے لیکن وائسرائے نے جواب دینا بھی گوارا نہ کیا جائز اور نا جائز کا کوئی سوال نہیں۔ حکومت



عبدالله حطاحب

تو تحریک کو کچل ڈالنے پر تلی ہوئی تھی اس لئے باغیوں سے وہ کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

اب عبید اللہ خاں کا قصہ سنئے۔ یہ بہادر نوجوان حکومت کی نظر میں اپنی ۳۸ دن کی بھوک ہڑتال سے کافی بدنام ہو چکے تھے۔ پہلے انھیں لدھیانہ لے گئے اس کے بعد ملتان۔ پھر کافی جدوجہد کے بعد سیالکوٹ جیل میں تبدیل کیا۔ یہاں ان کی صحت کچھ بہتر ہونے لگی اور آب و ہوا بظاہر موافق آگئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی انھیں پھر ملتان جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں پہنچنے پر یکم فروری ۱۹۴۳ء کو انھوں نے حکومت کے اس رویہ کے خلاف بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا اور احتجاج کیا کہ وہ انھیں اس جگہ رکھنے سے کیوں متواتر انکار کر رہی ہے جہاں کی آب و ہوا ان کے موافق ہے۔ جنگ آزادی کی تاریخ میں طویل مدت کے لحاظ سے اس بھوک ہڑتال کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ اس لئے قدرتاً سارا ملک اس طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ بھوک ہڑتال پورے ۷۰ دن تک جاری رہی۔ حکومت نے زبردستی ان کے پیٹ میں غذا پہنچانے کی بارہا کوشش کی جس میں کبھی وہ کامیاب ہوئی اور کبھی ناکام رہی۔ شاید جب کبھی وہ بیہوش ہوتے تھے تو کامیابی ہو جاتی تھی اور جیسے ہی انھیں ہوش آ جاتا تھا تو پھر غذا پہنچانا کسی طرح ممکن نہ ہوتا تھا۔ بالآخر پٹھان کے عہد مستقل کے سامنے حکومت کو بھی سر جھکانا

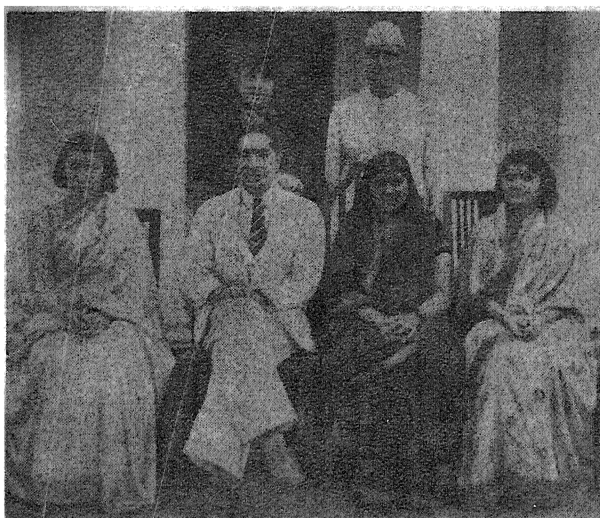
پڑا۔ جس کی زندگی یا ہوش و حواس پر بھوک ہڑتال بھی کوئی اثر نہ کر سکی۔ ان حالات میں اور کوئی شخص ختم ہو چکا ہوتا یا کم از کم دیوانہ ہو جاتا۔ ۸۰ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد وہ اپنے مطالبہ کے مطابق سیالکوٹ جیل میں تبدیل کر دئے گئے اور یہیں سے ۱۸ اگست کو وہ رہا ہوئے۔

عبید اللہ خاں کی مثال بڑی شاندار ہے لیکن قابل تقلید نہیں۔ یہ ستیاگرہ کی صحیح تعریف میں نہیں آ سکتی۔ اگر بھوک ہڑتال شروع کرنے سے پہلے وہ ستیاگرہ کے معتقدین سے دریافت کرتے تو غالباً ان کو اجازت نہ ملتی۔ لیکن انھوں نے جس بات کو حق سمجھا اس پر عمل کیا۔ ان کے اس فعل کی اہمیت اور قدر و قیمت اسی میں ہے کہ وہ اپنے ارادہ پر سختی سے قائم رہے اور اپنے اصول پر جان تک قربان کر دینے کو آمادہ ہو گئے۔ بڑے بھائی نہایت فخر کے ساتھ اپنے بیٹے کا قصہ سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ لڑکا جرأت و ہمت کا ایسا مجسمہ ہے جس کی مثال شاذ ہی مل سکتی ہے۔" لیکن اس سلسلہ میں باپ اور چچا کی ہمت بھی قابل تعریف ہے۔ یہ دونوں بھائی ہزاری باغ جیل میں تھے اور وہیں عبید اللہ خاں کے برت کی رفتار اخباروں میں دیکھا کرتے تھے حکومت نے کبھی لڑکے کی صحت کے متعلق انھیں کوئی اطلاع نہیں دی۔ اور انھوں نے بھی حکومت سے کبھی یہ درخواست نہیں کی کہ لڑکے کو دیکھنے کی یا

برت ترک کرنے کی ترغیب دینے کی اجازت دی جائے۔ جب آئے دن یہ خبریں آنے لگیں کہ اب بچنے کی کوئی امید نہیں ہے تو انھوں نے تجہیز و تکفین کے متعلق ہدایات بھیجدیں۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو ہدایات بھیجنے کے دو تین دن کے اندر یہ اطلاع موصول ہوئی کہ عبید اللہ خاں کو فتح ہوئی اور سیالکوٹ جیل میں انھوں نے اپنا برت ختم کر دیا۔ اس تکلیف دہ آزمائش کے باوجود جو اس بہادر لڑکے اور اس سے زیادہ اس کے باپ اور چچا کو برداشت کرنا پڑی ہیں کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں بھائیوں کے دل میں حکومت کی طرف سے کوئی عناد نہیں ہے۔ اس باپ نے جو اپنے بیٹے پر نازاں ہے، مسکرا مسکرا کر مجھے سارا قصہ سنایا اور ان کے بیان میں کوئی تلخی یا نفرت نہ تھی۔ حتیٰ کہ آخر میں انھوں نے کہا " لیکن ایک بات اس حکومت کی عجیب ہے۔ برت کھولنے کے بعد اس نے حیرت انگیز طریقہ پر عبید اللہ خاں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور جس خوبی سے اس کی تیمار داری کی اس میں تو کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ دراصل اتنی معقول تیمار داری ہی کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی۔ اس لئے میں حکومت کا ممنون بھی ہوں۔"

ڈاکٹر خاں صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے کے متعلق بھی چند الفاظ کہنا ہیں۔ ہدایت اللہ خاں گرانٹ میڈیکل کالج بمبئی میں پڑھتے تھے۔ وہ

اپنی تعطیل کا زمانہ گذارنے کے لئے اتمان زئی گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے تحریک میں کوئی حصہ نہ لیا تھا اور عنقریب کالج واپس جانے ہی والے تھے کہ آرڈی ننس کے ماتحت انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا اور اس بیچارے کو بھی چھ ماہ کی قید برداشت کرنا پڑی۔



پیچھے ۔ ڈاکٹر خانصاحب۔ مسز خانصاحب
کرسیوں پر۔ مہرتاج ۔ مس صوفیہ سومجی (سعداللہ
خاں کی منگیتر) سعداللہ خانصاحب ۔ مریم بی بی (ڈاکٹر
صاحب کی صاحبزادی)

باب نہم

خان برادران کی خصوصیات

ہندوستان میں آج یہ دونوں بھائی امریکہ کی اصطلاح میں "دشمن خلق" تصور کئے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بے نظیر قربانیاں کی ہیں۔ اور ایسی ایسی مصیبتیں اٹھائی ہیں کہ اوروں کو ایسا اتفاق نہ ہوا ہوگا۔ اب بھی ان کا قومی خدمت کا زمانہ باقی ہے اور چاہے وہ تمام عمر جیل میں رہیں ان کی اس مثال سے لوگوں میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ فروغ پاتا رہے گا۔ یہی وہ چیز ہے جو برطانوی حکومت کو خوف زدہ کئے ہوئے ہے۔ اگر اس کا بس چلے اور اس امر کی ایک شمہ بھر شہادت بھی مل جائے کہ انھوں نے واقعی تشدد کی تلقین یا حمایت کی ہے تو وہ انھیں گولی سے اڑا دینے میں ذرا بھی تامل نہ کرے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگوں پر ان کا اتنا زبردست اثر طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے اور قربانیاں کرنے کی وجہ سے ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ان کی سچی اور سادہ زندگی اس کا سبب ہے۔ چھوٹے بھائی تو بڑے خدا پرست اور دیندار ہیں لیکن بڑے بھائی پکے دنیا دار سپاہی ہیں۔ دونوں بھائیوں کو نمائش

اور دھوکے فریب کی اُن تمام باتوں سے سخت نفرت ہے جو سچائی کے خلاف اور حقیقت سے دور ہوں اگرچہ وہ ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن اُنھوں نے اپنی زندگی میں اتنی سادگی پیدا کرلی ہے کہ اس سے زیادہ ہونا مشکل ہے۔

۱۹۳۱ء میں جب چھوٹے بھائی باردولی گئے تو سردار ولبھ بھائی پٹیل اور دوسرے احباب اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کرنے آئے۔ یہ لوگ انھیں سکنڈ کلاس میں تلاش کرتے رہے لیکن وہ اپنے ہاتھ میں ایک ہینڈ بیگ لٹکائے ہوئے جس میں ایک جوڑا کپڑا اور ایک ٹائم ٹیبل کے سوا کچھ نہ تھا۔ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے سے برآمد ہوئے وہ بالکل ایک فقیر معلوم ہوتے ہیں اور واقعی وہ ہیں بھی فقیر۔ اگر وہ غریب سے غریب اور ادنیٰ سے ادنیٰ اٹھانوں میں بیٹھ جائیں تو انھیں پہچاننا مشکل ہوگا۔ ان کی انتہائی پاکیزہ زندگی۔ ان کا انکسار اور ان کی خود انکاری جادو کا سا اثر رکھتی ہیں۔ ان اوصاف نے ان میں ایسی کشش پیدا کردی ہے کہ لوگوں کو خود بخود ان سے عقیدت ہوجاتی ہے اور وہ بلا چون و چرا ان کا حکم ماننے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ "پنجاب کے بعض اردو اخبارات مجھ پر طرح طرح کے اتہام لگاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مجھے اسلام کا دشمن کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔"

لیکن ان تہمتوں سے بے نیاز ہوکر وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں جب وہ آزاد ہوتے ہیں تو کبھی چین سے نہیں بیٹھتے ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ دورہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنی قوم کی ترقی کی صورتیں تجویز کرتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اگر اتنا فاصلہ ہو کہ وہ پیدل جا سکتے ہوں تو کبھی سواری پر سفر نہیں کرتے اور مجبوراً اگر سواری پر جانا ہی پڑے تو سب سے سستے قسم کی سواری لیتے ہیں۔ انکا طرز زندگی بہت ہی سادہ ہے اور عیش و آرام سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ پھر کیا تعجب کہ جہاں کہیں وہ پہنچتے ہیں لوگ ان کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور بلا پس و پیش انتہائی وفاداری کے ساتھ ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود ان خوبیوں کے مجسمہ ہیں۔

جب انھیں ۱۹۳۴ء کے اجلاس کانگریس کا صدر منتخب کرنے کی تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے اسے منظور کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور فرمایا کہ "میں تو پیدائشی سپاہی ہوں اور ایک سپاہی کی حیثیت سے مرنا چاہتا ہوں۔ سرداری مجھے درکار نہیں"۔ لیکن وہ ایسے سپاہی ہیں جن کا حکم ماننے کو اور جن کے اشارے پر چلنے کو ہزاروں لاکھوں سپاہی تیار رہیں۔ وہ ہر طرح کے ڈھونگ اور ریاکاری سے بہت گھبراتے ہیں اور لیڈری کا مفہوم ان کے نزدیک خدمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تعمیری کام کے وہ کچھ آج سے

قائل نہیں بلکہ ہمیشہ سے وہ ایسے پروگرام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جس میں محض نمائش ہی نمائش ہو۔ کوئی ٹھوس کام نہ ہو۔

انگریزوں کی نیک نیتی کے متعلق اپنی زندگی میں اکثر انھیں بڑے ناخوشگوار تجربے ہوئے ہیں۔ پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی حکمت عملی کو ہر جگہ انھوں نے کارفرما پایا ہے اور ہر جگہ اس کی ناقابل بیان تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ کسی سرکاری افسر کی بات کا مشکل سے اعتبار کرتے ہیں لیکن انگریزوں سے انھیں کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ مہاتماجی نے انگریزوں کے ساتھ نجی رویہ کے متعلق جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس کے ایک ایک لفظ کی وہ تائید کرتے ہیں جو سرکاری افسر اُن کے بڑے بھائی کے دوست ہیں وہ ان کے بھی دوست ہیں۔ کتنے حیرت کی بات ہے کہ موجودہ گورنر جو ان کے خاندان سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کے بھائی کے مہمان اور میزبان دونوں رہ چکے ہیں۔ اُن کے متعلق اور ان کے ارادوں کے متعلق غلط بیانیوں کی تردید کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔

میرے نزدیک خان عبدالغفار خاں میں سب سے بڑی چیز ان کی روحانیت یا سچا جذبۂ اسلامی ہے۔ یعنی اللہ کے حضور میں سر تسلیم خم کر دینا اسی کسوٹی پر انھوں نے ہمیشہ مہاتماجی کی زندگی کو کسا ہے اور مہاتماجی سے

ان کی انتہائی عقیدت کی اور کوئی وجہ نہیں ہے ۔ مہاتما جی کی شہرت یا ان کی سیاسی سرگرمیاں یا بغاوت اور انقلاب پسندی کا جذبہ ان کے لئے کوئی وجہ کشش نہیں ہے ۔ صرف ان کی پاکیزہ اور زاہدانہ زندگی اور تزکیہ نفس کی کوشش سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں چنانچہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے خود ان کی ساری زندگی تزکیہ نفس کی ایک مسلسل اور متواتر کوشش سے عبارت ہے۔

مجھے بہت سے مسلم احباب کی دوستی کا فخر حاصل ہے جو فولاد کی طرح مضبوط اور مستقل ہیں اور ملک اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں لیکن آج تک ایک شخص بھی میں نے ایسا نہیں دیکھا جو غیر معمولی پاکیزہ اور سخت زاہدانہ زندگی کے لحاظ سے، انتہائی نازک جذبات کے لحاظ سے ۔ اور خدا پر کامل ایمان رکھنے کے لحاظ سے خان عبدالغفار خان سے زیادہ یا ان کے برابر بھی ہو ۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ " مہاتما جی کی زندگی میں جب کبھی کوئی پیچیدہ مسئلہ اور نازک موقع پیش آتا ہے اور وہ کوئی اہم فیصلہ کرتے ہیں تو میرا دل کہتا ہے کہ یہ اس شخص کا فیصلہ ہے جس نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا ہے ۔ اور خداوند تعالیٰ کبھی کسی کو غلط راستہ نہیں بتاتا ۔ اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ "مہاتما جی نے سارے روزے بلاشک و شبہ خدا کے حکم سے رکھے "۔ جب سیاسیات سے مہاتما جی کی علیحدگی کے

متعلق ان سے سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا "مجھے مہاتما جی کے اس فیصلہ پر ذرا تعجب نہیں ہے۔ میں ان کے فیصلوں پر کبھی اعتراض نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے ہیں اور پھر اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ ہر مصلح اعظم کی یہی کیفیت ہوتی ہے اور ہر مصلح کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اپنے پیروؤں سے رخصت ہوتا ہے اور ان کی معذوریوں اور کمزوریوں سے بے نیاز ہو کر نئی قوتوں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی خدمات کے دائرے کو محدود نہیں بلکہ اور وسیع کرلیتا ہے۔ بہرحال میری عقیدت کا صرف ایک پیمانہ ہے اور وہ یہی ہے کہ کوئی شخص خدا کے سامنے کیونکر سر تسلیم خم کرتا ہے۔" خاں صاحب انسانوں اور ان کے اعمال کو اسی معیار پر جانچتے ہیں اور اسی پر ان کو بھی پرکھنا چاہیئے۔

بڑے بھائی بالکل دوسری قسم کے آدمی ہیں۔ انھوں نے دور دراز ممالک میں سفر کیا ہے۔ طرح طرح کے آدمیوں سے ملے ہیں اور چھوٹے بھائی نے جتنی خود اپنی حقیقت پر نظر ڈالی ہے اتنا ہی بڑے بھائی بیرونی دنیا سے متاثر ہوئے ہیں۔ ایک طرف اگر چھوٹے بھائی اکثر اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں ڈوب جانا پسند کرتے ہیں تو دوسری طرف بڑے بھائی باہر نکلتے ہیں اور نئے نئے تعلقات پیدا کرتے ہیں چھوٹے بھائی اگر تادیب نفس پر ایمان

رکھتے ہیں تو بڑے بھائی زندگی کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کے قائل ہیں اور فطرت انسانی سے اس کی حیثیت سے زیادہ توقع نہیں کرتے۔ وہ ابتدا ہی سے بڑے اچھے کھلاڑی ہیں اپنے کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان رہے ہیں اور لندن کے قیام کے زمانہ میں تو نہ صرف کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑی تھے بلکہ (soccer) میں بھی مشہور رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کو ایک دلچسپ کھیل سمجھتے ہیں اور اسے اچھی طرح کھیلنے کے قائل ہیں اس لئے شاید ان کے لئے زیادہ مشکل تھا کہ برسوں کی عیش و آرام کی زندگی کے بعد اس عمر میں اپنی کشتی کو آگ لگا کر سیاسیات کے طوفان میں کود پڑیں۔ برخلاف اس کے چھوٹے بھائی نے تو ۲۹ برس ہی کی عمر میں آگ سے کھیلنا شروع کر دیا تھا اور اسی زمانہ سے مصیبت کی زندگی اس لطف سے گذار رہے ہیں جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ہر چیز کو کھلاڑی کی نظر سے دیکھا۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح زندگی میں تلخیاں بے شمار ہیں اسی طرح ہم اس کی خوشگوار لذتوں سے بھی محروم نہیں رکھے گئے ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم ان سے لطف اٹھائیں۔ لیکن چھوٹے بھائی زندگی کی تلخیوں ہی کے ذریعہ سے لذتوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

چھوٹے بھائی نفس کشی پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور ہمیشہ اس پر عمل کرتے ہیں لیکن بڑے بھائی جب تک موقع نہیں پڑتا اس کی پروا نہیں

کرتے لیکن جب موقع آتا ہے تو خوشی سے اسے برداشت کرلیتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ تمبا کو پینے کا تذکرہ ہو رہا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ وہ سگریٹ پینے کے اتنے عادی تھے کہ روزانہ پچاس سگریٹ سے کم نہ پیتے ہوں گے لیکن ۱۹۳۰ء میں انھوں نے سوچا کہ گرفتاریوں کا اتنا چرچا ہو رہا ہے۔ نہ جانے کس روز وہ بھی گرفتار ہو جائیں اس لئے انھوں نے طے کرلیا کہ اب کبھی سگریٹ نہ پئیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد سے پھر انھوں نے تمبا کو کو ہاتھ نہ لگایا لیکن خان عبدالغفار خاں نے اپنی عمر میں کبھی تمبا کو نہیں پی۔

ڈاکٹر خاں صاحب نے مجھے ایک قصہ سنایا تھا جو میں یہاں درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ کوئٹہ کے معاملہ میں کرنل سر رابرٹ سنڈیمن کافی مشہور ہو چکے ہیں۔ انہی کے صاحبزادے کرنل سنڈیمن گاندھی ارون معاہدہ کے دوران میں اپنے "گائیڈس" کے ہمراہ پشاور آئے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں سرکاری افسر اس معاہدہ پر بہت برہم تھے۔ کرنل سنڈیمن نے اپنے دوست ڈاکٹر خاں سے اپنے جذبات نہیں چھپائے اس پر ڈاکٹر خاں صاحب نے ان سے کہا "کرنل صاحب۔ یہ خیال تو اپنے ذہن سے بالکل نکال دیجئے کہ آپ کو شکست ہوئی ہے۔ سیاسی زندگی تو ایک کھیل ہے جس میں جیتنے اور ہارنے والے دونوں فریق کو بعد میں اسی طرح ہاتھ ملانا چاہئے جیسے کرکٹ یا

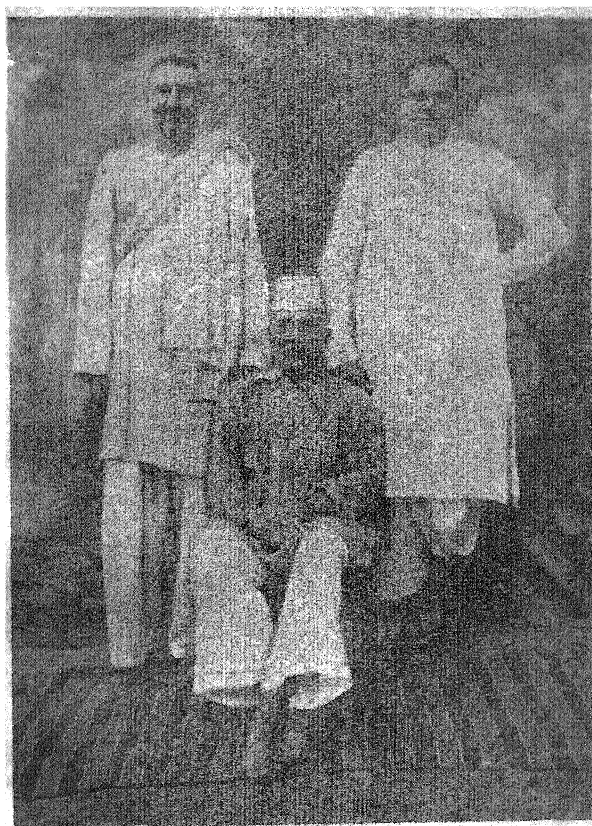
فٹ بال کی میچ کے بعد دونوں ٹیموں کے کھلاڑی ہاتھ ملاتے ہیں۔علاوہ ازیں اس معاملہ میں تو شکست و فتح کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو جنگ کا ایک عارضی التوا ہے جس میں نہ کوئی جیتا ہے نہ ہارا ہے " یہ کہہ کر انھوں نے کرنل صاحب کو فوراً مطمئن کر دیا۔اس کے بعد جب یہ دونوں رخصت ہوئے تو کرنل نے کہا" ہاں۔ہاں ہم نے ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح پہچان لیا ہے کہ اب شاید "گائڈس" چارسدہ میں کوئی مذموم حرکت کرنے کے قصوروار نہ ہوں گے "

چھوٹے بھائی اپنے مخالفوں سے خالص مذہبی جذبہ کے ماتحت ملتے ہیں لیکن بڑے بھائی ان سے بالکل کاروباری انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بھائی اپنے سخت سے سخت مخالف کے ساتھ نہایت صبر و سکون سے عرصہ تک گفت و شنید کر سکتے ہیں لیکن چھوٹے بھائی کے لئے ایک مقررہ حد سے تجاوز کرنا مشکل ہوتا ہے۔بڑے بھائی اسکول کے طالبعلموں سے ہنس بول سکتے ہیں لیکن چھوٹے بھائی ان لڑکوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے جو اس ناکارہ تعلیم میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ان کے اپنے خاص نظریئے ہیں جن سے بظاہر بڑے بھائی کو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن خان عبدالغفار خاں سے زیادہ کوئی اپنی کمزوریوں سے واقف نہیں ہے

بابِ نہم

ڈاکٹر خان صاحب کو اسمبلی کی امیدواری کے لئے آمادہ کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا لیکن چھوٹے بھائی کے سامنے کوئی یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت بھی نہ کرسکتا تھا۔ بڑے بھائی کو سیاسی حکمت عملی کی خدمات انجام دیتے میں کوئی تامل نہ ہوگا لیکن چھوٹے بھائی فطرتاً اس سے گریز کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کا جواب ہیں لیکن دونوں مل کر ایک بے نظیر مجموعہ بن جاتے ہیں۔ آپس میں یہ کتنے مختلف ہیں تاہم انتہائی خلوص۔ وفاداری۔ مسلک پرستی۔ اور گرمی محبت میں دونوں کتنے ملتے جلتے ہیں۔ دونوں اپنے آپ کو خدائی خدمت گار کہتے ہیں۔ دونوں کو اس نام سے عشق ہے اور دونوں کی زندگیاں اس مشکل لقب کا مستحق قرار پانے کی پیہم کوشش ہے۔



سیٹھ جمنا لال جی بجاج ۔ خان عبدالغفار خاں ۔
ڈاکٹر خانصاحب (یہ تصویر خانصاحب کی گرفتاری سے
ایک روز پیشتر ۷ دسمبر ۳۴ء کو لی گئی تھی)

باب دہم

پھر اپنے "اصلی گھر" میں

پچھلے نو باب چھپنے کے لئے بھیجے جا چکے تھے اس کے بعد یہ باب لکھا گیا۔ بات یہ ہوئی کہ حال ہی میں خان عبد الغفار خاں بغاوت کے الزام میں پھر گرفتار ہو گئے اس لئے مجھے خیال پیدا ہوا کہ اب تک کے سب حالات لکھ کر کتاب کو مکمل کر دوں۔

ہزاری باغ جیل سے رہائی کے بعد دونوں بھائیوں نے سیٹھ جمنالال بجاج کی مخلصانہ دعوت قبول کر لی تھی اور وردھا میں ان کے گھر کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ چونکہ مہاتما جی بھی ان اچھے سیٹھ جی کے مہمان کی حیثیت سے وردھا ہی میں تھے اس لئے اور بھی انھوں نے یہاں رہنا پسند کیا۔ وہ جیل سے یہ ارادہ کر کے نکلے تھے کہ اپنے آپ کو مہاتما جی کے سپرد کر دیں گے اور جو کچھ وہ کہیں گے اسی کی تعمیل کریں گے۔ اس عرصہ میں انھوں نے صوبہ متوسط۔ بنگال اور صوبہ جات متحدہ کے بعض مقامات کا دورہ کیا۔ اور دراصل یہ تمام دورے مہاتما جی ہی نے ترتیب دئے تھے، یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ جب کبھی

خاں صاحب کسی جگہ گئے تو مہاتماجی سے اس کے متعلق مفصل ہدایات لئے بغیر نہیں گئے کہ انھیں کیا کہنا چاہیئے اور کس طرح کہنا چاہیئے۔ اگر مہاتماجی مشورہ نہ دیتے تو بڑے بھائی ہرگز اسمبلی کی ممبری کے لئے کھڑے نہ ہوتے۔ انتخاب کے دوران میں انھیں یہ خیال ہوا کہ ڈاکٹر خاں صاحب کو محض انتخاب کے لئے صوبہ سرحد جانے کی اجازت حاصل کرنا چاہیئے لیکن مہاتماجی نے اس کا مشورہ نہیں دیا اس لئے یہ خیال ترک کر دیا گیا۔ خان عبدالغفار خاں مہاتماجی کی اجازت کے بغیر آل انڈیا سودیشی نمائش کا افتتاح کرنے کو بھی تیار نہ تھے اس لئے بمبئی کے احباب کو مہاتماجی سے درخواست کرنا پڑی کہ وہ خاں صاحب کو یہ دعوت منظور کرنے پر راضی کرلیں میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر مہاتماجی اصرار نہ کرتے تو خاں صاحب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی ممبری بھی قبول نہ کرتے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ میں سیاسیات اور عہدوں کا قطعی اہل نہیں ہوں۔ میں تو ایک ناچیز خادم ہوں۔ پٹنہ کے ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں خاں صاحب شریک ہو سکتے تھے لیکن وہ نہ گئے اور کہا کہ جن مسائل پر وہاں گفتگو ہونے والی ہے ان کے سلسلہ میں میری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں تو خاموشی سے دیہاتوں میں کام کرنے کی لگن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مہاتماجی نے انھیں آل انڈیا دیہی صنعتی ایسوسی ایشن کی مجلس

انتظامیہ کے لئے منتخب کیا تو انھوں نے خوشی سے اسے منظور کر لیا۔

چھوٹے بھائی کے مقابلے میں بڑے بھائی کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے کیونکہ وہ نہایت خوش طبع اور زندہ دل ہیں اور اپنے چھوٹے بھائی کی خشک اور زاہدانہ طبیعت سے بالکل مختلف مزاج رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خاں صاحب نے بغیر کسی نمائش اور ظاہر داری کے جمنا لال جی کے گھر والوں اور مہمانوں کے علاج معالجے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ جمنا لال جی کا گھر آج کل اچھی خاصی مہمان سرائے بن رہا ہے کیونکہ مہاتما جی سے ملنے اور مختلف جلسوں میں شریک ہونے کی غرض سے آئے دن بے شمار احباب وردھا آتے رہتے ہیں اس کے بعد انھوں نے اپنی خدمات وردھا کے عورتوں اور لڑکیوں کے آشرم کو پیش کیں جو بڑی خوشی سے قبول کی گئیں۔ حال ہی میں انھوں نے حفظان صحت اور معالجہ کے سلسلہ میں قرب وجوار کے دیہات میں جانا شروع کیا تھا اور روزانہ دس پندرہ میل پیدل چلا کرتے تھے۔ یہ سابق آئی۔ ایم ایس دنیا کے کسی کام کو ذلیل اور اپنے سے فروتر نہیں سمجھتے۔ میں نے انھیں مریضوں کے پاس بیٹھے اور اپنے ہاتھ سے سینکتے اور شوربے کے لئے ترکاریاں کاٹتے دیکھا ہے۔ مرض سے افاقہ کے بعد وہ خاص طور پر یہ شوربہ تجویز کیا کرتے ہیں۔ علی الصبح وہ مہاتما جی کے ساتھ چہل قدمی کے لئے

جانے کو آشرم میں آجاتے تھے۔ وہ چُپ چاپ ان کے ساتھ جاتے تھے۔ راستے میں ایک لفظ بھی نہ بولتے تھے۔ اس کے بعد آشرم کے مریضوں کو دیکھ بھال کر گھر واپس چلے جاتے تھے۔ کانگریس کی ساری تاریخ میں اس سے زیادہ غیر متزلزل وفاداری اور رضاکارانہ فرمانبرداری کی دوسری دو مثالیں ملنا مشکل ہیں۔

اپنے خانگی معاملات میں بھی یہ دونوں بھائی گاندھی جی سے مشورہ کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ وردھا کے مختصر قیام کے زمانے میں خان عبدالغفار خان کو عورتوں اور لڑکیوں کا آشرم دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں کی سادہ زندگی کی فضا۔ پاکیزگی۔ آزادی اور محنت و مشقت نے آپ کے دل کو موہ لیا اور آپ نے فوراً یہ خیال ظاہر کیا کہ آپ بھی اپنی لڑکی کو جو لندن میں اپنی چچی کی نگرانی میں تعلیم پا رہی ہے واپس بلالیں گے اور وردھا ہی میں اسے تعلیم دلائیں گے۔ یہ نہایت شاندار فیصلہ تھا لیکن اگر ایک پٹھان لڑکی انگلستان کے اسکول میں تعلیم پا سکتی ہے تو وردھا کنیا آشرم میں تعلیم پانے میں اسے کوئی دقت کیوں محسوس ہو۔ پھر خاں صاحب کو میرا بہن اور آشرم کی صدر معلمہ سے بہتر اپنی لڑکی کی تربیت کے لئے اور کون مل سکتا تھا۔ یہی دلیل انھوں نے مہاتما جی کے سامنے پیش کی۔ اور اسی وجہ سے انھیں بھی میرا بہن کو یہ تار



پیچھے - شری متی جانکی دیوی بجاج - میرا بہن
درمیان میں - اما بجاج - سیٹھ جمنالال بجاج - مہر تاج
سامنے - رام کرشنا بجاج - عبدالعلی خان

دینے میں کوئی تامل نہ ہوا کہ یہ تاج کو اپنے ساتھ لیتی آئیں۔ دونوں نے ایک اطالوی جہاز کے تیسرے درجہ میں سفر کیا اور ۲۲ نومبر کو وردھا پہنچ گئیں۔

لڑکی نے ڈیڑھ برس بعد اپنے والد کو دیکھا لیکن اس کے چھوٹے بھائی عبدالعلی نے جو دہرہ دون میں کرنل براؤن کے اسکول میں تعلیم پا رہا تھا پورے چار سال سے انھیں نہ دیکھا تھا وہ اپنے والد سے یوپی کے دورے میں ملا۔ اور ۴ دسمبر کو ان کے ساتھ وردھا آیا۔

خیال تو کیجئے کہ جب ۸ دسمبر کو ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے والد کی گرفتاری کی خبر ملی ہوگی تو ان کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ جب جمنالال جی نے ان کے بارہ برس کے لڑکے کو یہ خبر سنائی تو اس نے دریافت کیا "جب آپ اور مہاتماجی آزاد ہیں تو پھر میرے باپ کیوں گرفتار ہوئے" یہ کہہ کر وہ سسکیاں بھر کے رونے لگا۔ جمنالال جی نے اسے دلاسا دیتے ہوئے سمجھایا کہ "انھوں نے بمبئی میں حکومت کے نزدیک باغیانہ تقریر کی تھی اس لئے وہ گرفتار ہوگئے"۔ اس کے بعد جمنالال جی کو اس انداز سے بغاوت کا مطلب سمجھانا پڑا کہ اس بچہ کی سمجھ میں آسکے۔

لیکن ان بچوں کے آنسوؤں کے ساتھ باپ کے آنسو شامل نہ ہوئے انھیں معلوم تھا کہ اُس دوستی کی نعمت انھیں حاصل ہے جو آزمائشوں سے

اور بڑھتی جائے گی گھٹ نہیں سکتی۔ یعنی گاندھی جی اور جمنا لال جی کی دوستی جن کی سپردگی میں وہ اپنے بچّوں کو بلا کسی تردد کے چھوڑ سکتے تھے۔ وردھا کے اس چند روزہ قیام سے ان دونوں بھائیوں اور گاندھی جی اور جمنا لال جی میں ایک خاص اخوت اور روحانی تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ ان میں کوئی سیاسی گفتگو نہ ہوتی تھی۔ البتہ روحانی صحبتیں اکثر رہا کرتی تھیں جن میں وہ خاموشی سے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ یہاں کے سب رہنے والے اس سے بہت متاثر ہوئے ہیں کہ خاں صاحب روز صبح آشرم میں آتے تھے اور گاندھی جی سے تلسی داس کی رامائن سنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اکثر صبح شام کی پرارتھنا میں بھی شریک ہوتے تھے۔" اس بھجن کا نغمہ میری روح کو معمور کر دیتا ہے،" ایک مرتبہ انھوں نے پیارے لال جی سے کہا " مہربانی فرما کر اسے اردو میں لکھ دیجئے اور اس کا [illegible] بھی کر دیجئے۔" فطرتاً وہ عزلت پسند ہیں اس لئے وہ تنہائی میں عبادت کرنا اور خاموشی سے کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آئندہ بنگال کے دیہاتوں میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب سے دو ماہ قبل جب وہ بنگال گئے تو وہاں مسلم کسانوں کی جھونپڑیوں میں انھوں نے غربت کے وہ دردناک منظر دیکھے جس کا علاج صرف کھادی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اس لئے ان کی خواہش تھی کہ دیہی صنعتوں کو از سر نو زندہ کرنے کا پیغام ان کو پہنچائیں اور پھر بنگال کے لئے روانہ ہونے والے تھے لیکن جمنالال جی نے اُن سے اصرار کیا کہ دیہی صنعتی ایسوسی ایشن کے پہلے جلسہ میں ضرور شریک ہوں اس لئے انھوں نے اپنی روانگی ۱۵ر دسمبر کے لئے ملتوی کر دی ۔ ۷ر دسمبر کی شام کو ہم لوگ ان کے بنگال کے کاموں کے متعلق بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس گرفتاری کا وارنٹ لئے ہوئے آپہنچے۔ خاں صاحب ایسے موقعوں کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اس لئے انھوں نے فوراً کہا کہ میں اسی وقت چلنے کو حاضر ہوں۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ نے انھیں اپنے احباب۔ اپنے بچوں اور بھائی سے ملنے کا موقع دیا جب وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے تو گاندھی جی نے فرمایا "اچھا خاں صاحب بخلاف پچھلے موقعوں کے اس مرتبہ مقدمہ کی پیروی کیجائے گی" اس پر وہ چونک پڑے اور کہا کہ "۱۹۱۹ء سے میرا جو طرز عمل رہا ہے اس کے خلاف کرنا مجھے سخت ناگوار ہوگا" مہاتما جی نے جواب دیا "مجھے اس معاملہ میں آپ کے جذبات کا احساس ہے لیکن اب وہ موقع نہیں ہے کیونکہ حتی الامکان اب ہم جیل جانا نہیں چاہتے" اس کے بعد فوراً انھوں نے فرمایا "بہتر ہے ۔جو آپ کی مرضی" یہ ان کی دلکش فرمانبرداری کی دوسری مثال تھی۔

بڑے بھائی کو سخت صدمہ ہوا کہ وہ اپنے اس بھائی سے زبردستی جدا کر دئے گئے جو تین سال تک جیل میں اور سو دن تک اس محدود آزادی کے زمانے میں ان کی خوشی اور غم میں برابر شریک رہے تھے لیکن چھوٹے بھائی کو کوئی رنج نہ تھا۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بچوں کو نصیحت کی کہ بہادر بنا اور گاندھی جی اور جمنالال جی کے سایہ عاطفت میں سادگی اور تادیب نفس کا سبق سیکھنا۔

لیکن ایک چیز کا اثر ان کے چہرے پر ضرور تھا۔ انھوں نے فرمایا:۔ "کاش بنگالی دیہات کے مسلمانوں سے میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر سکتا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں تمھارے درمیان آکر رہوں گا اور تمھاری خدمت کروں گا لیکن افسوس کہ مجھے اس کا موقع نہ ملا" پھر کچھ ٹھہر کر انھوں نے درد بھرے لہجے میں کہا "سرحد والوں کے متعلق میں کیا کہوں۔ میری گرفتاری سے مشتعل ہو کر پٹھانوں کو کوئی مذموم حرکت نہ کرنا چاہیے بلکہ بڑے سکون کے ساتھ یہ خبر سننا چاہیے اور بیٹھ کر اپنے اندرونی اختلافات مٹانے کی ٹھنڈے دل سے کوشش کرنا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم پر طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں اور ہمیں اس کا موقع بھی نہیں دیا جاتا کہ ہم ان کی تردید کر سکیں۔ ایک سرکاری اعلان میں میرے

صوبہ کو " خونی صوبہ " کا لقب دیا گیا ہے۔ لیکن حکومت کو یہ کہنا زیب نہیں دیتا کیونکہ اس نے سیدھے سادے جاہل پٹھانوں میں تعلیمی اور معاشرتی اصلاح جیسے غیر سیاسی کام کا بھی کون سا موقع دیا"

جب ممبئی کی روانگی کا وقت قریب آیا تو اس سچے خدائی خدمت گار کے دل سے یہ رنج بھی دور ہوگیا۔ "مجھے بالکل یقین ہے" انھوں نے جمنالال جی اور اُن کی دھرم پتنی جانکی دیوی سے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ "یہ سب خدا کی مرضی کے ماتحت ہو رہا ہے۔ جبتک اس نے مجھ سے باہر کام لینا چاہا باہر رکھا۔ اب اس کی مرضی ہے کہ میں جیل کے اندر سے خدمت کروں تو جیل جا رہا ہوں۔ جس میں وہ خوش ہے اسی میں میں بھی خوش ہوں"